٧٨٦

شعر العجم

حصۂ سوم

فغانی سے ابو طالب کلیم تک

مادۂ تاریخ آغاز تصنیف
تاریخ عجم
۱۳۲۴ ہجری

مادۂ تاریخ اختتام تصنیف
تذکرہ
۱۳۲۵ ہجری

از

جناب **شبلی نعمانی** مرحوم

بفرمائش

شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور

۱۹۲۴ء

در مطبع کریمی لاہور باہتمام میر قدرت اللہ طبع شد

قیمت عہ

غلام نقی حسین کاتب امین آبادی

فہرست مضامین شعر العجم سوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ایرانی شاعری

کا

دور آخر

ایران میں تیموری خاندان کا اخیر فرمان روا، سلطان حسین میرزا تھا اس کے آخری زمانے میں سلطنت صفویہ کا آغاز ہوا جس کی اجمالی کیفیت یہ ہے، کہ شیخ صفی الدین آردبیلی ایک مشہور خاندان سادات کے سجادہ نشین تھے، ان کی اولاد میں سلطان حیدر ایک بزرگ پیدا ہوئے جنکے مرید قرمزی رنگ کی بارہ گوشے کی ٹوپی پہنتے تھے اور اس مناسبت سے قزلباش کہلاتے تھے جس کا لفظی ترجمہ سرخ سر ہے وہ ایک معرکہ میں شہید ہوئے، ان کے صاحبزادے شاہ اسمٰعیل نے محرم سنہ ۹۰۵ ہجری میں ستر آدمیوں کے ساتھ آذربائجان پر چڑھائی کی اور رفتہ رفتہ اپنی جماعت اس قدر بڑھائی کہ شروان پر حملہ آور ہو کر وہاں کے فرمانروا کو شکست دی، انہوں نے ۲۵ برس کی مدت میں ایک وسیع سلطنت قایم کر لی اور حکومت صفویہ کی بنیاد ڈالی، سنہ ۹۳۰ ہجری میں ان کا انتقال ہو گیا،

ان کے بعد ان کے بیٹے طہماسپ نے سلطنت کو اور زیادہ ترقی دی چنانچہ فوج کی تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تک پہنچائی اور دُور دُور تک کے صوبے فتح کر لیے، ۵۵ برس حکومت کر کے ۹۸۴ھ ہجری میں وفات پائی، ان کے بعد ان کا بیٹا اسمعیل مرزا اور پھر اسکے بعد اس کا بیٹا شاہ عباس ۹۹۵ھ ہجری میں فرمان روا ہوا، شاہ عباس وسعت حکومت اور انتظامات ملکی میں دوسرا اکبر یا شاہجہان تھا، اس نے ایران کو اس سرے سے اُس سرے تک زیر نگین کیا، اُزبکوں سے خراسان چھینا، آرمینیہ پر فتح حاصل کی، عراق عرب کو مسخر کیا، ترکوں سے برابر کی صلح کی، غرض خراسان سے لے کر عراق تک اس کی حدود حکومت میں آگیا، اُس نے ملک کی امن و امان آبادی اور سرسبزی کے لئے جو جو کام کئے، ہندوستان کا تیموری خاندان بھی نہ کر سکا، ملک میں اس سرے سے اُس سرے تک کاروان سرائیں بنوائیں، جن میں مسافروں کے لئے سلطنت کی طرف سے تمام چیزیں مہیا رہتی تھیں، والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتا ہے،

جمیع عمارات معظمہ ایران بنا کردۂ آں شہریار است، چندیں شہر در مازندران وخراسان وعراق وآذربائیجان ساختہ است، خصوصاً اصفہان راکہ رشک جنان نمودہ اقانو نے بجہت مہمانداری مسافران بحر و بر بستہ بود کہ در جمیع مراحل و منازل از یک ہزار و از ہزار تا دہ ہزار از غریب و تونگر از رعیت وسپاہ کہ از بومے و تغریب ہر کس وہر قدر بودند، در کاروان سراہا کہ ساختہ است، ہر گاہ وارد مے شدند ہماں لحظہ مایحتاج حتی بستر و فراش در خور ہر کس ملازمان شاہی کہ بایں کار گماشتہ بودند، حاضر مے کردند وظروف در کمال تکلف از چینی وغوری وغیرہ در ہر منزل ومکان آں قدر بودہ کہ ہمہ مسافران راکفایت ہمے کرد و باز بہ

تحویلداران مکان سپرده مے شد و این امر بیشتر از عراق تا ماژندران بوده و در اطراف و بلاد دیگر نیز رواج داشتہ لیکن نہ باین افراط،

شاہ عباس نے ۴۴ سال حکومت کرنے کے بعد ۱۰۳۸ھ ہجری میں وفات پائی اس کے بعد شاہ صفی اور اس کے بعد شاہ عباس ثانی تخت نشین ہوا اور ۱۰۷۷ھ ہجری میں وفات پائی۔
اس خاندان نے اگرچہ سُنّی مذہب کو نہایت ظلم اور بے رحمی اور سفاکی کے ہاتھ ایران سے معدوم کر دیا، یعنی جو لوگ شیعہ مذہب قبول نہ کرتے تھے وہ قتل کر دیئے جاتے تھے، چنانچہ ماثر الامرا وغیرہ میں اس کی متعدد داستانیں نقل کی ہیں۔

لیکن بہرحال تمام ملک میں یکسوئی پیدا ہوگئی، اتنا بڑا وسیع ملک جھگڑوں سے پاک ہوگیا تمدن و تہذیب[۱] کو نہایت ترقی ہوئی، ہر چیز میں حد سے زیادہ نفاست اور تکلف شروع ہوا، اس کا اثر شاعری پر بھی پڑا، اور اس لئے شاعری میں نہایت لطافت اور نزاکت پیدا ہوگئی،

صفوی خاندان خود صاحب علم و فضل اور سخن سنج اور سخن شناس تھا، اس لئے اس نے شعر کی نہایت قدر و منزلت کی۔

شاہ عباس ایک دفعہ کوکبۂ شاہی کے ساتھ جا رہا تھا، اُدھر سے حکیم شفائی مشہور شاعر آ رہا تھا، شاہ عباس نے سواری سے اُتر جانا چاہا، شفائی نے بڑے اصرار سے روکا تاہم امرا اور درباری گھوڑے سے اُتر پڑے[۲]، شاہ عباس اکثر مسیح کاشی کے گھر اُن سے

---

[۱] خدانخواستہ اسکے یہ معنی نہیں کہ سُنّی مذہب کے مٹانے کو تہذیب و تمدن میں دخل ہے بلکہ غرض یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں مذہبی نزاعیں مٹجایئں تو ضرور ملک میں ترقی ہوگی۔ اگر ایران میں شیعہ مذہب بالکل مٹجاتا۔ تب بھی یہی نتیجہ ہوتا

[۲] سرو آزاد،

ملنے جایا کرتا تھا،

چونکہ اسی زمانے میں ہندوستان میں تیموری خاندان شاہانہ فیاضیوں کا دریا بہا رہا تھا اور ایران کے شعرا دولت کی کشش سے ادھر کھچے چلے آتے تھے، اس لئے صفوی خاندان اور بھی رقیبانہ حوصلہ مندیوں پر مجبور ہوتا تھا، لیکن ایران سے اس معرکہ میں آخر ہندوستان ہی نے بازی جیتی،

ہندوستان میں اگرچہ شاعری بابر کے ساتھ آئی، چنانچہ آتشی قندھاری حسین کا یہ مطلع مشہور ہے،

بیا درکشتی چشمم نشین و سیر دریا کن
سر شکم رفتہ رفتہ بے تو دریا شد تماشا کن

بابر[۱] کے ساتھ ہندوستان میں آیا، لیکن شاعری کی تربیت بیرم خانخاناں سے شروع ہوئی، وہ خود پختہ کار شاعر تھا اور ترکی اور فارسی دونوں زبانوں میں کہتا تھا، اکثر شعرا اس کے دربار میں ملازم تھے نظیری سمرقندی نے اس کے اشارہ سے شاہنامہ ہمایونی لکھنا شروع کیا تھا اور کئی داستانیں نظم کیں، چنانچہ جب سکندر لودی کا معرکہ نظم کرکے سنایا تو بیرم خانخاناں نے اس پر نکتہ چینی کی، نظیری نے بیرم خان کی اصلاح اور ہدایت کے موافق ایک رات میں چارسو شعر لکھ کر سنائے اور بیش بہا صلہ حاصل کیا، بدایونی نے بعض اشعار نقل بھی کئے ہیں،

اکبر گو اُمی تھا لیکن نہایت خوش ذوق اور قدردان سخن تھا، اس نے ملک الشعرائی کا خاص عہدہ قائم کیا، جس پر سب سے پہلے غزالی مامور ہوا، اکبر کی فیاضیاں دیکھ کر ایران کے تمام شعرا ہندوستان میں اُمنڈ آئے، اکبری شعرا کی فہرست جو ابوالفضل نے آئین اکبری

[۱] بدایونی جلد سوم صفحہ ۱۰۰

میں درج کی ہے حسب ذیل ہے،

حکیم سنائی[1]، غزالی[2]، عرفی[3]، نظیری[4] نیشاپوری، حزنی[5] اصفہانی، قاسم[6] کاہی، امیلی[7] ہروی،
جعفر[8] بیگ قزوینی، خواجہ حسین[9] مروی، حیاتی[10] گیلانی، شکیبی[11] صفاہانی، انیسی[12] شاملو، صالحی[13] ہروی،
محوی[14] ہمدانی، صرفی[15] ساوجی، قراری[16] گیلانی، عتابی[17] نجفی، ملا صوفی[18] مازندرانی، جدائی[19] مرنزی،
وقوعی[20] نیشاپوری، خسروی[21] قاینی، وفائی[22] سپاہانی، شیخ ساقی[23]، رفیعی[24] کاشانی، غیرتی[25] شیرازی،
حالتی[26]، سنجر[27] کاشی، جذبی[28]، تشبیہی[29] کاشی، اشکی[30] قمی، اسیری[31] رازی، فہمی[32] رازی، قیدی[33] شیرازی،
پیروی[34] ساجی، کامی[35] سبزواری، پیامی[36]، سید محمد[37] ہروی، قدسی[38] کربلائی، حیدری[39] تبریزی
سامری[40]، قریبی[41] شاپور، فسونی[42] شیرازی، نادری[43] ترشیزی، نوعی[44] مشہدی، بابا طالب[45] اصفہانی،
سرمدی[46] اصفہانی، دخیل[47] اصفہانی، قاسم[48] ارسلان مشہدی، غیوری[49] حصاری، قاسمی[50] مازندرانی،
رہی[51] نیشاپوری،

یہ وہ لوگ ہیں جو دربار میں پہنچے،

ابوالفضل ان ناموں کو لکھ کر لکھتا ہے "وآنانکہ سعادت بار نیافتند واز دور دستہا گیتی خداوند را ستایشگر، بس انبوہ" چوں قاسم گونابادی، ضمیری سپاہانی، وحشی بافقی، محتشم کاشی، ملک قمی، ظہوری ترشیزی، ولی دشت بیاضی، نیکی، صبری، فکاری، حضوری، قاضی نوری، صافی طونی طریزی، رشکی ہمدانی، ان میں سے بھی بجز دو تین کے سب ہندوستان میں آئے تھے،

اکبر اور جہانگیر وغیرہ سلاطین، خود صاحب مذاق اور نکتہ سنج تھے اس لئے شعرا فن شعر میں ترقی کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس کے ساتھ چونکہ تقرب حاصل کرنے کی غرض سے ہر شاعر دوسرے سے بڑھ جانا چاہتا تھا، اس لئے خود بخود ان سخن سنجوں کے کلام میں زور

پیدا ہوتا جاتا تھا، اور ہر ایک اپنے کلام میں کوئی نہ کوئی جدت پیدا کرتا تھا،

اکبر نے بارہا اساتذہ کے اشعار پر نکتہ چینیاں کیں، اور نقادان فن نے اس کی تنقید کی داد دی، ایک دفعہ کسی نے **فغانی** کا یہ شعر پڑھا۔

فغانی آفتاب من بدیں اعزاز مے آید
مسیحا یار و خضرش ہم رکاب و ہم عنان عیسیٰ

اکبر نے برجستہ اصلاح دی، مصرع
فغانی شہسوار من بدیں اعزاز مے آید

جہانگیر کا ذوق شاعری اسی قدر صحیح تھا جس قدر ایک بڑے نقاد فن کا ہو سکتا ہے، جس شاعر کی نسبت اس نے جو کچھ لکھ دیا ہے، اس سے بڑھ کر اس کے متعلق ریویو نہیں کیا جا سکتا، طالب آملی ایک مدت تک اس کے دربار میں شاعری کرتا رہا، لیکن اس نے ملک الشعرائی کا خطاب اس کو اُس وقت دیا جب وہ درحقیقت اس منصب کے قابل ہوا، چنانچہ خود لکھتا ہے،

دریں تاریخ تخت نشینی کے چودھویں سال، طالب آملی بخطاب ملک الشعرا خلعت امتیاز پوشیدہ، چوں رتبہ سخنش از ہمگنان درگذشت، در سلک شعرائے پایۂ تخت منتظم گشت، ایں چند بیت از وست،

پھر چند شعر طالب کے انتخاب کئے ہیں کہ خود طالب اس سے اچھا انتخاب نہیں کر سکتا تھا،

ایک دفعہ **خانخاناں** نے یہ غزل طرح کی، ع ہر یک گل زحمت ہر خارمے باید کشید، مراد صفوی اور مرزا مراد نے بھی اس طرح میں غزلیں لکھیں، طرح کا مصرع چونکہ نہایت شگفتہ تھا جہانگیر نے فی البدیہ مطلع کہا،

ساغرمے بر رخ گلزار مے باید کشید
ابر بسیار ست مے بسیار مے باید کشید

لے بر رخ گلزار یعنی گلزار کے سامنے،

طرح کا مصرع جامی کی غزل کا ہے، جہانگیر نے پوری غزل نکلوا کر دیکھی، لیکن چونکہ یہی ایک مصرع کام کا تھا، تزک میں لکھتا ہے۔

"ایں مصرع ظاہر شد کہ از مولانا عبدالرحمٰن جامی ست، غزل او تمام بہ نظر در آمد غیر ازاں مصرع کہ بطریق مثل زبان زد روزگار شدہ دیگر کارے نساختہ بغایت سادہ و ہموار گفتہ[1]،

ایک دفعہ دربار میں امیر الامراء کا یہ شعر پڑھا گیا،

بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق — یک زندہ کردن تو بصد خون برابر ست

جہانگیر کے اشارے سے سب نے اس پر غزلیں لکھیں، جہانگیر نے ملا احمد مہرکن کا شعر پسند کیا چنانچہ یہ تمام واقعہ خود تزک میں لکھا ہے جو حسب ذیل ہے۔

بہ تقریبے ایں بیت امیر الامراء خواندہ شد، ع بگذر مسیح از سر ما کشتگان عشق چوں طبع من موزون ست گاہے بہ اختیار و گاہے بے اختیار مصراعے و رباعی، یا بیتے در خاطرم سر میزند ایں بیت بر زبان گذشت"

از من متاب رخ کہ نیم بے تو یک نفس — یک دل شکستن تو بصد خون برابر است

چوں خواندہ شد ہر کس کہ طبع نظمے داشت دریں زمین بیتے گفتہ گذرانید، ملا احمد مہرکن کہ احوال او پیش ازیں گذشت، بد نہ گفتہ بود،

اے محتسب[2] زگریہ پیر مغان بترس — یک خم شکستن تو بصد خون برابر است

فرہنگ جہانگیری جب جہانگیر کے سامنے اس کے مصنف نے پیش کی تو جہانگیر نے نہایت قدردانی کی چنانچہ لکھتا ہے۔

---

[1] تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڈھ صفحہ ۳۴۳ [2] تزک جہانگیری صفحہ ۱۱۱،

"میر عضد الدولہ از آگرہ آمدہ ملازمت نمود، فرہنگے کہ در لغت ترتیب دادہ بہ نظر در آوردہ، الحق محنت بسیار کشیدہ، خوب پیروی ساختہ و جمیع لغات را از اشعار علماء قدما مستشہد آوردہ، دریں فن کتابے مثل[۱] ایں نمے باشد،"

ایک دفعہ[۲] ایک شاعر نے جہانگیر کی مدح میں قصیدہ لکھ کر پیش کیا، مطلع کا پہلا مصرع یہ تھا،

اے تاج دولت بر سرت از ابتدا تا انتہا

جہانگیر نے کہا تم عروض بھی جانتے ہو؟ شاعر نے کہا نہیں، جہانگیر نے کہا اچھا ہوا ورنہ تمہارے قتل کا حکم ہوتا، پھر مصرع کی تقطیع کر کے بتایا کہ دوسرا رکن یوں آتا ہے "لت بر ست" اور یہ سخت بے ادبی ہے،

اس زمانے میں مئی تخلص ایک شاعر تھا جو قوم کا کلال تھا، کلالوں کی قوم شاہی درباروں میں دربانی اور چاؤشی کے لئے مخصوص تھی، مئی نے بہ تقریب شاعری نور جہان بیگم کے ذریعہ سے جہانگیر کے دربار میں رسائی پیدا کرنی چاہی، جہانگیر نے کہا کہ ان لوگوں کا کام چاؤشی اور سواری کا اہتمام ہے، ان کو شاعری سے کیا مناسبت، لیکن چونکہ نور جہان کی خاطر عزیز تھی، اجازت دی، مئی نے یہ شعر پڑھا،

مئی بگریہ سرے دار وائے نصیحت گر　　کنارہ گیر کہ امروز روز طوفان ست

جہانگیر نے کہا دیکھا وہی اپنے پیشے کی رعایت، دوسرے موقع پر پھر نور جہان بیگم نے تقریب کی، مئی نے مطلع پڑھا

من میروم و برق زنان شعلۂ آہم　　اے ہمنفسان دور شوید از سر راہم

جہانگیر نے ہنس کر کہا وہ اثر کہاں جا سکتا ہے[۳]

---

[۱] تزک جہانگیری صفحہ ۲۵۹، [۲] تذکرہ سرخوش ذکر جہانگیر، [۳] تذکرہ سرخوش ذکر مئی،

سلسلۂ سخن میں ہم کہاں سے کہاں نکل آئے، جہانگیر کی لائف لکھنی مقصود نہیں، لیکن یہ دکھانا ہے، کہ ان سلاطین کے دربار میں شعروشاعری کی جو ترقی ہوئی وہ صرف اس لئے نہ تھی کہ شاعری سے دولت ہاتھ آتی تھی بلکہ زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ یہ سلاطین خود موزون طبع تھے نقاد فن تھے، اچھے بُرے کی تمیز رکھتے تھے، موقع بہ موقع شعرا کو ٹوکتے رہتے تھے، ان کو صحیح داد دیتے تھے اس لئے اُن کے دربار حقیقت میں شاعری کی تعلیم گاہ تھے،

دکن میں ابراہیم عادل شاہ کی قدردانی اور فیاضی نے **بیجاپور** کو ایران کا ٹکڑا بنا دیا تھا ظہوری اور ملک قمی اس کے دربار کے ملازم تھے اور اکبری کشش بھی ان کو دلّی اور آگرے نہ کھینچ سکی، برہان پور میں نظام شاہ بحری گویا اس فن کا مربی تھا، ظہوری نے ساقی نامہ اسی کی شان میں کہا ہے، جس کا بیش بہا صلہ عطا ہوا تھا۔

ہندوستان کی یہی فیاضیاں تھیں جن کی بنا پر تمام ایران ادھر کھچا چلا آتا تھا، خود شعرا کی زبان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے،

میرزا صائب

ہمچو عزم سفر ہند کہ در ہر دل ہست — رقص سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

ابوطالب کلیم

اسیر ہندم وزین رفتن بیجا پشیمانم — کجا خواہد رساندن پرفشانی مرغ بسمل را
بہ ایران میروند نالان کلیم از شوق ہمراہان — بپائے دیگران ہمچوں جرس طے کردہ منزل را
ز شوق ہند زان سان چشم حسرت بر قفا دارم — کہ رو ہم گر براہ آرم نے بینم مقابل را

علی قلی سلیم

نیست در ایران زمین سامان تحصیل کمال — تا نیامد سوئے ہندوستان حنا رنگین نشد

دانش مشہدی

راہ دور ہند پابست وطن دارد مرا
چوں حنا شب درمیان رفتن ہندستان خوش ست

ہندوستان کی قوت کشش اس زمانے کے ساتھ مخصوص نہیں ہمیشہ سے اس کی قدردانی کے شہرے ایرانیوں کے لئے دام تسخیر تھے، خواجہ حافظ کو بادشاہ بغداد نے بار بار بلایا، لیکن جگہ سے نہ ہلے، شیراز ہی میں بیٹھے بیٹھے غزلیں لکھ کر بھیجدیں، لیکن دکن سے تحریک ہوئی تو جہاز میں سوار ہوکر ہرمز تک آئے، جامی ایران میں تھے لیکن قصیدے ہندوستان میں بھیجتے تھے،

جامی اشعار دلاویز تو جنسے ست لطیف
پودش از حسن بود و زسر معنے تارش
ہمرہ قافلہ ہند روان کن کہ رسد
شرف عز قبول از ملک التجارش

علی نقی کمرہ نے ۲۵ شعروں کا قصیدہ فیضی کی مدح میں لکھ کر بھیجا جس میں کہتا ہے،

مرا فگند بر نظم امور مرپرتو فیضی
ابوالفیض آں گزین اکبر و شیخ کبیر من

ہندوستان میں سلاطین اور شہزادوں کے علاوہ امرا اکثر سخن فہم اور قدردان تھے ان میں ابوالفتح گیلانی اور عبدالرحیم خانخانان نے شاعری کی اکاڈیمی (بیت العلما) قایم کی، جس کی بدولت شعرانے اس فن میں نہایت ترقی کی، ابوالفتح ایک خط میں خانخانان کو لکھتا ہے،

"قصائدے کہ یاران آن جا گفتہ بودند بشعرائے ایں جا فرسودہ شد، بنام نامی شما ہر گاہ باتمام مے رسد بہ ملازمت فرستادہ خواہد شد، ملاعرفی و ملاحیاتی بسیار ترقی کردہ اند [1]

[1] چہار باغ یعنے مکاتیب حکیم ابوالفتح،

عبد الباقی ماثر رحیمی میں لکھتا ہے،

اکثرے از اعیان دولت وارکان سلطنت بادشاہ مرحوم (اکبر) دست گرفتہ وتربیت کردہ دے (حکیم ابو الفتح) اند وہر کہ تازہ از ولایت آمدہ بندگی ومصاحبت ایشان اختیار مے نمودہ، چنانچہ خواجہ حسین ثنائی ومیرزا قلی میلی وعرفی شیرازی وحیاتی گیلانی وسائر مستعدان درخدمت او بودہ اند،

شعر کی تاریخی زندگی میں یہ واقعہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان میں آکر فارسی شاعری نے ایک خاص جدت اختیار کی، جس کی تفصیل ہم کسی آئندہ موقع پر لکھیں گے، یہ جدت حکیم ابو الفتح کی تعلیم کا اثر تھا، مآثر رحیمی میں ہے،

ومستعدان وشعر سنجان ایں زمان را اعتقاد آں ست کہ تازہ گوئی کہ دریں زمان درمیانہ شعرا مستحسن است وشیخ فیضی، ومولانا عرفی شیرازی وغیرہ بہ آں روش حرف زدہ اند، بہ اشارہ وتعلیم ایشان (حکیم ابو الفتح) بودہ (مآثر رحیمی تذکرۂ حکیم حاذق)

اسی طرح خانخانان کی شاہانہ فیاضیوں اور شاعرانہ نکتہ سنجیوں نے شعر وشاعری کے حق میں ابر کرم کا کام دیا، خانخانان نے احمد آباد میں ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کیا جس میں ہر فن کی نہایت نادر کتابیں جمع کیں، ایک عجیب خصوصیت اس کتب خانے کی یہ تھی کہ جس قدر مشہور شعرا اس کے دربار میں تھے، ان کے دیوان خود ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کتب خانے میں محفوظ تھے، اکثر شعرا اس کتب خانے کی خدمت پر مامور تھے، یہیں غزلوں کی طرحیں دیجاتی تھیں، شعرا مشاعرے کرتے تھے، خانخانان خود بھی شریک صحبت ہوتا تھا اور قدر دانی سے دل بڑھاتا تھا، خود بھی ان طرحوں میں غزلیں کہتا تھا،[۱]

[۱] اس کتب خانے کا حال مآثر رحیمی کے مختلف مقامات میں درج ہے،

رسمی قلندر ایک ایرانی درویش شاعر تھا، اس نے خانخانان کی تربیت شعر و شعرا کا ذکر ایک قصیدے میں تفصیل سے کیا ہے، چنانچہ خانخانان کو مخاطب کرکے کہتا ہے،

زمین مدح تو آں نکتہ سنج شیرازی — رسید صیت کلامش بروم از خاور
بطرز تازہ ز مدح تو آشنا گردید (یعنے عرفی) — چو روے خوب کہ یابد ز ماشطہ زیور
ز فیض نام تو فیضی گرفت چوں خسرو — بہ تیغ ہندی اقلیم سبعہ را یکسر
ز ریزہ چینی خوانت نظیری شاعر — رسیدہ است بجائے کہ شاعران دگر
کنند بہر مدیحش قصیدۂ انشا ق — کہ خون رشک چکد از دلِ سخن پرور
سواد شعر شکیبی جو کحل اصفاہان — بہ تحفہ سوے خراسان برند اہل نظر
ز مدحت تو حیاتی حیات دیگر یافت — بلے مقوی طبع عرض بود جوہر
حدیث نوعی و کفوہی بیان چہ سازم من — چو زندہ اند بمدح تو تا دم محشر
ز نعمت تو بہ نوعی رسید آں مایہ — کہ یافت میر معزی ز نعمت سنجر

خانخاناں اس درجے کا سخن سنج تھا کہ اگر وہ شاعری میں پڑتا، تو عرفی اور نظیری کا ہمسر ہوتا، اس طرح میں، چہ دست، پند ست، فرزند ست تمام مشہور شعرا نے زور آزمائیاں کی ہیں، نظیری اور خانخانان کی غزلیں ہم بالمقابل درج کرتے ہیں، دونوں کا خود موازنہ کرو،

خانخانان

شمار شوق ندانستہ ام کہ تا چند ست
جز ایں قدر کہ دلم سخت آرزومند ست
بر کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار ست

نظیری

بحرف اہل غرض قرب و بعد پابند ست
دل شکستہ ما را ہزار پیوند ست
ازاں دمم کہ بحسرت فگندہ دیدن او

نگاہِ اہل محبت تمام سوگند ست | نگہ بگوشۂ چشمم ہنوز در بند ست

نہ دام دانم و نہ دانہ این قدر دانم | نظر دلیر نشد تا مژہ بہ پیش آمد

کہ پائے تا بسرش ہر چہ ہست در بند ست | حجاب اگر پر کاہ ست کوہ الوند ست

مرا فروخت محبت و لے ندانستم | دو چشم ساکن بیت الحزن بمن گردید

کہ مشتری چہ کس ست و بہای من چند ست | کہ من اسیر بمعشوقم او بہ فرزند ست

ادائے حق محبت عنایتی ست ز دوست | در از دستی حسن کہ گل بہ چشم ریخت

وگرنہ خاطر عاشق بہیچ خرسند ست | کہ تا بدامنم از جیب در شکر خند ست

ازاں خوشم بہ سخنہائے دلکش تو رحیم | بہ کینہ جوئی افلاک عشق مے بازم

کہ اند کے بہ اداہائے عشق مانند ست | کہ ہر کہ دشمن ما شد بہ دوست مانند ست

نظیری از تو بجان کندن ست لب بکشائے

با این قدر کہ بگوئی بمیر خرسند ست

دونوں غزلوں کے موازنہ کرنے کا یہ موقع نہیں، لیکن صاحب ذوق سمجھ سکتا ہے کہ **خانخانان** کے کلام میں جو صفائی، شستگی، دلاویزی اور سوز و گداز ہے **نظیری** کی غزل اس سے بالکل خالی ہے، خانخانان کی فیاضی اور قدردانی سے جو شعرا اور اہل کمال اس کے دربار میں جمع ہو گئے، سلاطین کو بھی یہ بات نصیب نہیں ہوئی، مآثر رحیمی میں ان تمام شعرا کا مفصل تذکرہ ہے،

عُرفی نے جب یہ قصیدہ پیش کیا ع اے داشتہ در سایہ ہم تیغ و قلم را، تو ایک لاکھ روپئے دلوائے[1]،

[1] کلمات الشعرا سرخوش ذکر خانخانان

عرفی خانخاناں کی مدح میں خصوصیت کے ساتھ اپنے کمال سخن کی داد چاہتا ہے کیونکہ جانتا ہے کہ وہ خود اس فن کا حریف ہے، چنانچہ کہتا ہے،

سخن شناسا دیدی و دیده باشی هم — علوِ پایهٔ من در مقام سحبانی
فلاں مربی و من تربیت پذیر این بس — ز فضل خود چه زنم لاف هائے طولانی

مربیان سخن کے سلسلہ میں علی قلی خان، خان زمان، خان اعظم کوکلتاش، ظفر خان، اور غازی خان، کا نام بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، خان زمان اکبری دربار کے امرائے کبار میں سے تھا، جو بالآخر حریف سلطنت بن کر مارا گیا، وہ خود شاعر اور قدردان سخن تھا، سلطان تخلص کرتا تھا، چنانچہ بدایونی نے شعرا کے ذیل میں اس کا حال لکھا ہے، اکثر شعرا اس کے دربار میں ملازم تھے، ایک دفعہ جب اس نے یہ غزل لکھی،

باریک چو موئے ست میانے کہ تو داری — گویا سر آں موست دہانے کہ تو داری

تو اکثر شعرا نے اس کا تتبع کیا، ایک شاعر نے یہ مطلع لکھا،

گفتم کہ گمانے ست دہانے کہ تو داری — گفتا کہ یقین ست گمانے کہ تو داری

غزالی جب ایران سے دکن میں آیا اور حسب دلخواہ اُس کی قدردانی نہیں ہوئی تو خان زمان نے ہزار روپے اور چند گھوڑے بھیجکر بلایا اور یہ قطعہ لکھ کر بھیجا،

اے غزالی بحق شاہ نجف — کہ سوے بندگان بیچون آئے
چوں کہ بے قدر گشتہ آں جا — سر خود گیر زود بیرون آئے

"سر خود گیر" سے ہزار روپے کا کنایہ تھا، کیونکہ غزالی کا پہلا حرف غ ہے جسکے عدد ہزار ہیں، غزالی دکن سے جونپور میں آیا اور جب تک خان زمان زندہ رہا اس نے اور کسی دربار کی طرف رخ نہیں کیا، جونپور میں جا کر اُس نے ایک مثنوی نقش بدیع لکھ کر پیش

کی جس میں ایک ہزار شعر تھے، خان زمان نے وہ صلہ دیا جو سلطان محمود نہ دے سکا تھا، (فی شعر ایک اشرفی) اس مثنوی کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتا ہوں کہ ناظرین خان زمان کی صحیح المذاقی کا اندازہ کر سکیں،

خاک دل آں روز کہ مے بیختند | شبنمے از عشق برو ریختند
دل کہ بہ آں رشحہ غم اندود شد | بود کبابے کہ نمک سود شد
بے اثر مہر چہ آب وچہ گل | بے نمک عشق چہ سنگ وچہ دل
ذوق جنون از سر دیوانہ پرس | لذت سوز از دل پروانہ پرس

خان زمان کے مرنے کے بعد غزالی اکبر کے دربار میں آیا، اور ملک الشعرا کے خطاب سے ملقب ہوا، خاندان تیموریہ میں یہ پہلا شخص تھا جو اس منصب پر ممتاز ہوا، الفتی یزدی خان زمان ہی کے دربار میں ملازم تھا[۱]،

خان اعظم کوکلتاش اکبر کا رضاعی بھائی تھا اور اس کے ساتھ کا کھیلا تھا، اکبر اسکی ناز برداریاں کرتا تھا، اور کہتا تھا "چہ کنم در میان من وخان اعظم دریائے شیر حائل ست"، خان اعظم نہایت قابل نہایت نکتہ سنج اور بہت بڑا مورخ تھا، جہانگیر اس کی نسبت لکھتا ہے۔

در علم سیر وفن تاریخ استحضار تمام داشت ودر تحریر وتقریر بے نظیر بود[۲] ودر مدعا نویسی ید طولی داشت، ودر لطیفہ گوئی بے مثل بود وشعر ہمواری مے گفت

ایں رباعی از واردات اوست،

عشق آمد واز جنون برومندم کرد | وارستہ زصحبت خردمندم کرد
آزاد ز بند دین ودانش گشتم | تا سلسلۂ زلف کسے بندم کرد

---

[۱] بدایونی جلد سوم تذکرہ الفتی صفحہ ۱۸۹، [۲] تزک جہانگیری،

ملائے بدایونی اس کی نسبت لکھتے ہیں "بہ انواع فضائل وہنر موصوف ست وبفہم عالی وادراک بلند او کسے دیگر را از امرا نشان نمے دہند" ملا صاحب نے اس کا ذکر شعرا کے ذیل میں کیا ہے، اور اس کے اشعار بھی نقل کئے ہیں، ایک مطلع سُننے کے قابل ہے،

گشت بیمار دل از رنج وغم تنہائی　　　اے طبیب دلِ بیمار چہ مے فرمائی؟

خانِ اعظم نے اکثر شعرا کی تربیت کی جن میں سے جعفر ہروی، سہمی، مدامی، بدخشی، مقیمی، سبزواری کا ذکر بدایونی نے اپنی تاریخ میں کیا ہے،

میرزا غازی قندھار کا صوبہ دار تھا ایران کے شعرا جو کابل اور قندھار کی راہ سے ہندوستان میں آتے تھے پہلے میرزا غازی ہی کے خوان کرم سے فیضیاب ہوتے تھے،

ظفرخان صوبہ دار کشمیر اس رتبہ کا شخص تھا کہ کلیم اور مرزا صائب کو اُسکی اُستادی اور مربی گری کا اعتراف ہے، صائب ایک مدت تک اس کے دربار میں رہا اور اس کی بدولت شاعری میں ترقی کی، ظفرخان اس کے کلام میں موقع بموقع دخل اور تصرف کرتا تھا، صائب نے اپنے دیوان کی ترتیب بھی اسی کے اشارے سے کی، چنانچہ صائب ان باتوں کا احسانمندی کے ساتھ اعتراف کرتا ہے،

لہ ظفرخان کا نام احسن اللہ خاں اور احسن تخلص ہے، ظفرخاں کا باپ خواجہ ابوالحسن ۱۰۳۳ سنہ ہجری میں جہانگیر کا وزیر اعظم مقرر ہوا اور کابل کی حکومت مستزاد ملی، ظفرخاں باپ کی نیابت میں کابل کا صوبہ دار ہو کر گیا، شاہجہان نے ابوالحسن کو ۱۰۴۲ سنہ ہجری میں کشمیر کا صوبہ دار مقرر کیا، جب وہ اسی سنہ میں انتقال کر گیا تو ظفرخان کشمیر کا مستقل حاکم مقرر ہوا ظفرخان نے اپنے ایام حکومت میں تبت کو فتح کیا، اور ۱۰۷۳ سنہ ہجری میں وفات پائی، ظفرخان صاحب دیوان ہے، ذیل کے شعر سے اس کی طبیعت کا اندازہ ہوگا،

دلم بکوے تو امیدوار مے آید　　　نگاہ دار کہ روزے بکار مے آید

حقوق تربیتت راکہ در ترقی باد | زبان کجاست کہ در حضرتت فرو خوانم
تو جان زدخل مجا مصرع مراد اوی | تو در فصاحت دادی خطاب سحبانم
ز وقت تو بمعنی شدم چنان باریک | کہ مے توان بہ دل مور کرد پنہانم
چو زلف سنبل ابیات من پریشان بُو | نہ داشت طرۂ شیرازہ روسے دیوانم
تو غنچہ ساختی اوراق بادبردۂ من | وگرنہ خارنمے ماند از گلستانم

صاحب ماٰثر الامرا ظفر خاں کے حال میں لکھتے ہیں،

زر ہا بمردم ایران مے داد خصوصاً در حق شعرا طرفہ بذل و کرم مے فرمود ما سخنوران صاحب استعداد دل از اوطان برداشتہ روے امید بدرگاہش مے گزاشتند و بمنتہاے تمناے رسیدند، افصح المتاخرین میرزا صائب تبریزی چوں از ایران بہ کابل رسید از گرمجوشی و دریابخشئ اودل بستہ مجتبش گردید،

ظفر خان نے ایک عجیب مرقع طیار کرایا تھا جو آج ہاتھ آتا، تو لاکھوں روپے کو ارزان تھا یعنے ایک بیاض تیار کرائی تھی، جس میں ہر شاعر اپنا منتخب کلام خود اپنے ہاتھ سے لکھتا تھا، اور صفحہ کی پشت پر اُس کی تصویر ہوتی تھی[1]

اس زمانے میں شاعری کی ترقی کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ مشاعرہ کا رواج قائم ہوا، اس سے پہلے شعرا بطور خود، اساتذہ کی غزلوں پر غزل لکھتے تھے، اب (یعنی فغانی کے زمانے سے) یہ طریقہ قایم ہوا کہ کسی امیر صاحب مذاق کے مکان پر شعرا جمع ہوتے تھے، پہلے سے کوئی طرح دیدی جاتی تھی، سب اس طرح میں غزلیں لکھ کرلاتے تھے اور پڑھتے تھے، کبھی کبھی برسر محفل برابر کے دعویداروں میں چوٹ چل جاتی تھی، سوال و جواب ہوتے تھے، اور اس طرح

[1] ماٰثر الامراء،

مسابقت اور حریف پیشگی شاعری کو ترقی دیتی جاتی تھی،

ان تمام مجموعی حالات نے شاعری پر جو اثر کیا، اور جو خصوصیتیں پیدا کیں حسب ذیل ہیں،

(۱) غزل کی ترقی،

اگرچہ اس زمانے میں قصیدہ، مثنوی، غزل، رباعی، ان تمام اصناف سخن کا بہت بڑا ذخیرہ پیدا ہو گیا، لیکن درحقیقت یہ عہد غزل کی ترقی کا عہد ہے، غزل میں مختلف اسٹائل (طرز) قایم ہوئے جن کی تفصیل یہ ہے۔

واقعہ گوئی یا معاملہ بندی یعنی اُن واقعات اور معاملات کا ادا کرنا جو عشق عاشقی میں پیش آتے ہیں ہم پہلے لکھ آئے ہیں کہ واقعہ گوئی کے موجد سعدی ہیں، اور امیر خسرو نے اس پر معتدبہ اضافہ کیا لیکن اس عہد میں یہ ایک مستقل صنف ہو گئی، جس کا بانی اول میرزا اشرف جہان قزوینی ہے جو شاہ طہماسپ صفوی کا وزیر تھا، مولوی غلام علی آزاد خزانہ عامرہ میں لکھتے ہیں،

چوں نوبت سخن سنجی بہ میرزا اشرف جہان رسید طبع او مائل وقوع گوئی بسیار افتاد و این طرز را بجد کثرت رسانید،

شرف جہان کا دیوان ہمارے کتب خانے میں ہے ہم اس سے اس کتاب کے چوتھے حصے میں کام لیں گے، یہاں ہم اس کے بعض اشعار اس غرض سے نقل کرتے ہیں کہ وقوع گوئی کا مفہوم سمجھ میں آسکے،

با ہر کہ بینمش چو بہ پرسم کہ کیست ایں | گوید کہ ایں ز عہد قدیم آشنای ماست
نہان از و بہ رخش داشتم تماشائی | نظر بجانب من کرد و شرمسار شدم
چناں گوید جواب من کزان گرد و رقیب آگہ | بمجلس گر من بیدل از و حرفے نہان پرسم

شرف جہان نے ۹۶۲ سنہ ہجری میں وفات پائی،

اس طرز کو جن لوگوں نے اپنا خاص موضوع بنالیا، وہ وحشی یزدی، علی قلی میلی اور علی نقی کمرہ ہیں، وحشی یزدی چونکہ رند اور اوباش مزاج تھا اور بازاری معشوقوں سے اس کو زیادہ سروکار رہا، اس لئے اس طرز کو اس نے کسی قدر اعتدال سے بڑھادیا، واسوخت کی ابتدا بھی اسی نے کی اور اسی پر اس کا خاتمہ ہوگیا،

فلسفہ | غزل میں فلسفہ کی آمیزش عرفی نے خاص طور پر کی، لیکن اس طرز کو بہت ترقی نہیں ہوئی، اس کے ہمعصروں اور مابعد کے شعرا نے بہت کم اس طرز میں کہا،

مثالیہ | یعنی کوئی دعویٰ کرنا اور اس پر شاعرانہ دلیل پیش کرنا، اس طرز کے بانی کلیم، علی قلی سلیم، میرزا صائب اور غنی ہیں، یہ طرز نہایت مقبول ہوا یہاں تک کہ شاعری کے خاتمے تک قائم رہا،

تغزل | تغزل سے یہ مراد ہے کہ عشق اور عاشقی کے جذبات موثر الفاظ میں ادا کئے جائیں، یہ وصف اگرچہ لازمہ غزل ہے لیکن نظیری نیشاپوری، حکیم شفائی اور علی نقی نے اسکو زیادہ نمایاں کیا، ان لوگوں میں اور وقوع گویوں میں یہ فرق ہے کہ وقوع گو شعرا ہوس پرست اور بازاری معشوقوں کے عاشق ہوتے ہیں، اور اُسی قسم کے واقعات اور خیالات باندھتے ہیں، بخلاف اس کے متغزلین کا معشوق شاہد بازاری نہیں ہوتا، اور نہ ان کا عشق متبذل اور اوباشانہ ہوتا ہے،

خیال بندی اور مضمون آفرینی | یہ وصف تمام متاخرین میں ہے لیکن اس طرز خاص کا نمایاں کرنے والا جلال اسیر ہے جو شاہ جہان کا ہمعصر ہے، شوکت بخاری، آقا سم دیوانہ وغیرہ نے اس کو زیادہ ترقی دی، اور ہمارے ہندوستان کے شعرا بیدل اور ناصر علی وغیرہ اسی گرداب

کے تیراک ہیں،

قصیدہ، قصیدہ کا ایک خاص طرز عرفی نے قایم کیا جس کی کوئی تقلید نہ کرسکا، ظہوری طالب آملی، حسین ثنائی نے بھی اس صنف کو کچھ کم ترقی نہیں دی،

مثنوی، مثنوی بالکل اپنے درجے سے گر گئی (فیضی اس سے مستثنیٰ ہے) مثنوی میں عموماً تاریخی واقعات یا اخلاقی مضامین ادا کئے جاتے ہیں لیکن ان مضامین کے لئے سادگی اور پختگی درکار ہے، متاخرین ہر بات میں رنگینی کے عادی ہو گئے تھے، اس لئے مثنوی مثنوی نہیں رہی، بلکہ غزل بن گئی، کلیم کا شاہجہان نامہ پڑھو رزم لکھتے ہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ بزم نشاط میں گانا ہو رہا ہے۔

رباعی، یہ زمانہ اس امتیاز پر ناز کرسکتا ہے رباعی نے فلسفہ کے تمام مسایل ادا کردیئے، سحابی، استرآبادی جو اکبر کا ہمعصر اور نجف میں معتکف تھا اس نے کم از کم سترہ ہزار رباعیاں لکھیں جو سرتاپا فلسفہ سے مملو ہیں، اس کا ایک انتخاب جس میں سات ہزار رباعیاں ہیں، ہمارے پاس ہے اور ہم شعر العجم کے چوتھے حصہ میں جہاں فلسفیانہ شاعری پر بحث کریں گے اس کے کلام کا انتخاب پیش کریں گے یہ تمام تفصیل خاص خاص انواع شاعری کے متعلق تھی، عام طور پر طرز ادا اور اسلوب بیان میں جو جدتیں پیدا ہوئیں، اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) قدما اور متوسطین کسی خیال کو پیچیدگی سے نہیں ادا کرتے تھے، متاخرین کا یہ خاص انداز ہے کہ جو بات کہتے ہیں پیچ دے کر کہتے ہیں، یہ پیچیدگی زیادہ تر اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ جو خیال کئی شعروں میں ادا ہو سکتا تھا، اس کو ایک شعر میں ادا کرتے ہیں، مثلاً قدسی کہتا ہے،

عیش ایں باغ باندازہ یک تنگ دل ست — کاش گل غنچہ شود تا دل ما بکشاید

مطلب یہ ہے کہ دنیا کا باغ ایک نہایت مختصر باغ ہے اس میں اسی قدر وسعت ہے کہ

صرف ایک تنگ دل آدمی خوش ہوے، اس لئے یہ نہیں ہوسکتا کہ میرا دل بھی شگفتہ ہو،
اور پھول کی کلی بھی کھل سکے، اس بنا پر آرزو کرتا ہے کہ کاش پھول کلی بن جائے۔ تاکہ
میرے دل کی شگفتگی کی گنجایش نکل سکے، اس مضمون کو فلسفیانہ نظر سے دیکھیں تو یہ
خیال ادا کرنا مقصود ہے کہ دنیا میں جب کسی کو فائدہ پہنچتا ہے تو اس کے یہ معنی ہیں کہ
دوسرے کو نقصان پہنچا، کسی بادشاہ نے ملک فتح کیا، یعنے دوسرے کو شکست ہوئی،
یہ خیال کسی حیثیت سے دیکھا جائے ایک شعر میں سمانے کے قابل نہ تھا، اس لئے
جب ایک ہی شعر میں اُس کو ادا کرنا چاہا تو خواہ مخواہ پیچیدگی پیدا ہوگئی،

کبھی یہ پیچیدگی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے کہ کوئی مبالغہ، یا استعارہ یا تشبیہ نہایت دور
از کار ہوتی ہے، اس لئے سننے والے کا ذہن آسانی سے اُس کی طرف منتقل نہیں ہوسکتا مثلاً
شوکت بخاری کہتا ہے،

گوش ہا را آشیان مرغ آتش خوارہ کرد برق عالم سوز یعنے شعلۂ غوغاے من

شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے جو آہیں کیں اس قدر گرم تھیں کہ اس سے شعلے نکلے،
یہ شعلے لوگوں کے کانوں میں پہنچے، یہاں تک کہ لوگوں کے کانوں میں آگ بھر گئی،
اس بنا پر مرغ آتش خوار نے جس کی غذا آگ ہے کانوں میں اپنا گھونسلا بنا لیا کہ ہر
وقت غذا ملتی رہے،

چونکہ کسی شخص کا ذہن اس طرف نہیں جاسکتا کہ آہ کی گرمی سے کان آتشکدے بن
جائیں گے اس لئے مضمون آسانی سے سمجھ میں نہیں آسکتا،

(۲) اس زمانے کے اکثر مضامین کی بنیاد الفاظ پر اور صنعت ایہام پر ہے، یعنے لفظ کے
لغوی معنے کو ایک حقیقی بات قرار دے کر اس پر مضمون کی بنیاد قایم کرتے ہیں، مثلاً

امروز نیم شہرہ عالم ز ضعیفی　　　عمریست کہ از ضعف فتادم بزبانہا

بزبان افتادن کے اصطلاحی معنے مشہور ہونا ہے، لیکن لغوی معنی "زبان پر پڑنا ہے"
مضمون کی بنیاد اسی لغوی معنی پر ہے لکھتا ہے کہ کمزوری اور ضعف میں مَیں کچھ آج سے
مشہور نہیں ایک مدت ہے کہ میں زبانوں پر چڑھ گیا ہوں، زبان پر پڑنے کے معنے
چونکہ اصطلاح میں مشہور ہونے کے ہیں، اس لئے یہ دعویٰ صحیح ہے لیکن شاعر لغوی معنی
لے کر ضعف کو یوں ثابت کرتا ہے کہ میں اس قدر ضعیف ہوں کہ لوگوں کی زبانوں پر چڑھا
پھرتا ہوں،

متاخرین کی شاعری سے اگر ایہام کو الگ کر دیا جائے، تو اُن کی شاعری کا بہت بڑا
حصہ دفعتہً برباد ہو جائے گا،

(۳) اس دَور کا بڑا امتیازی وصف، استعارات کی نزاکت اور جدت تشبیہ ہے تمدن
کی ترقی میں جس طرح تمام اسباب معاشرت و تمدن میں تکلفات پیدا ہو جاتے ہیں، اسی طرح
زبان اور خیالات میں بھی نزاکت اور تکلفات پیدا ہو جاتے ہیں مثلاً "آنکھیں فرش راہ ہیں"
گو بجائے خود اچھا استعارہ ہے، لیکن **نظیری** کہتا ہے،

مے خواست بوسہ رخت اقامت بگسترد　　　از فرش جبہ راہ بر آں خاک کو نہ بود

بوسہ چاہتا تھا کہ بستر اڈالے لیکن اُس کی گلی میں اس قدر پیشانیوں کا فرش بچھا ہوا تھا کہ جگہ نہ تھی،
یا مثلاً **شانی** کہتا ہے،

شانی دلت بکج کلہان مائل ست باز　　　ایں لالہ را بطرف کلاہ کہ میزنی

یعنے اے شانی تیرا دل کج کلاہوں پر مائل ہو رہا ہے۔ اس پھول کو کس کی ٹوپی میں لگانا چاہتا ہے۔
استعارات کی جدت و نزاکت، متاخرین کا عام انداز ہے، لیکن اس خاص وصف میں

طالب آملی سب سے زیادہ ممتاز ہے،

(۴) اس زمانے میں الفاظ کی نئی تراشیں اور نئی نئی ترکیبیں کثرت سے پیدا ہوئیں، مثلاً پہلے میکدہ، آتشکدہ وغیرہ مستعمل تھے، اب نشترکدہ، مرہم کدہ وغیرہ ترکیبیں پیدا ہوئیں، یا مثلاً پہلے ایک گلشن گل یک چمن گل کہتے تھے، اب یک خندہ لب یک آغوش گل، یک دیدہ نگاہ وغیرہ کہنے لگے، اس قسم کی ترکیبیں عرفی، فیضی، نوعی، نے کثرت سے پیدا کیں، ان ترکیبوں سے اکثر جگہ مضمون کا اثر بڑھ جاتا ہے، مثلاً

ع، شکن بروئے شکن خم بروئے خم چیند،

ع، موج بر موج شکستم چو بہ عمان رفتم،

ع، بہر یک لب خندہ نتوان منت شادی کشید،

ع روئے بروئے حسن کن دست بدست ناز دہ،

اس سے زیادہ یہ کہ ایک بڑا خیال ایک چھوٹے سے لفظ سے ادا ہو جاتا ہے مثلاً یہ شعر

بہ دور گردی من از غرور مے خندد حریف سخت کمانے کہ در کمین دارم

کہنا یہ تھا کہ میں معشوق سے محبت کرتا ہوں لیکن الگ الگ رہتا ہوں کہ تیر عشق کا گھائل نہ ہو جاؤں، لیکن معشوق میرے اس کترا کے پھرنے پر ہنستا ہے کہ میری زد سے بچ کر کہاں جائے گا، اس خیال کے ادا کرنے کے لئے دور گردی کا لفظ نہ ہو تو ایک شعر میں یہ مطلب ادا نہیں ہو سکتا تھا،

چونکہ ان تمام خصوصیات کی زیادہ تفصیل ان شعرا کے کلام کے ذیل میں آئے گی جن کے ہاں یہ خصوصیات زیادہ پائے جاتے ہیں، اس لئے اس موقع پر ہم اس گرہ کو زیادہ نہیں کھولتے،

فغانی شیرازی

تمام اہل فن اور ارباب تذکرہ کا اتفاق ہے کہ متوسطین کی شاعری میں انقلاب پیدا ہوکر جو نیا دور قائم ہوا جو متاخرین اور نازک خیالوں کا دور کہلاتا ہے، اس کا بانی فغانی ہے لیکن افسوس اور سخت افسوس ہے کہ ایسے شخص کے حالات بھی ارباب تذکرہ دو چار سطر سے زیادہ لکھنا گوارا نہیں کرتے، بہر حال ایک ایک نکتہ کا سراغ لگا کر جو سرمایہ ہاتھ آیا ہے وہ نذر احباب ہے۔

فغانی کا وطن شیراز ہے، سام میرزا نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ "پہلے چاقو بنایا کرتے تھے"، شاعری کا آغاز تھا کہ ہرات میں آئے، اس زمانے میں شاعری کا جو انداز مقبول عام تھا، سلطان حسین میرزا کے شعرا کا انداز تھا، چونکہ فغانی کا رنگ ان سے الگ تھا، اسلئے کسی نے ان کی قدر نہ کی بلکہ ان کے کلام کو اس قدر لغو سمجھتے تھے کہ جب کسی کا کوئی مہمل شعر پڑھا جاتا تھا تو کہتے تھے فغانیہ[1] ہے، جامی اس وقت تک زندہ تھے، فغانی ان سے ملے لیکن ان سے بھی فغانی کو داد نہ ملی، بالآخر تبریز میں آئے، یہاں سلطان یعقوب فرمانروا تھا، اس نے ان کی نہایت قدر دانی کی، چنانچہ انہوں نے اس کی مدح میں قصیدے لکھے جو دیوان میں موجود ہیں، سلطان نے ان کو بابا کا خطاب[2] دیا، سلطان یعقوب کے انتقال کے بعد بیورو میں آکر قیام کیا،

---

[1] تذکرہ عرفات اوحدی [2] ید بیضا،

نہایت لاأوبالی مزاج اور رند تھے، شراب حد سے زیادہ پیتے تھے، اکثر میخانوں میں گذرتی تھی، اسی بنا پر بیورد کے حاکم نے ان کا روزینہ شراب اور گوشت مقرر کر دیا تھا اخیر عمر میں توبہ کی اور مشہد میں معتکف ہو گئے، ۹۲۵ھ ہجری میں وفات پائی،

شروع میں جب اپنے بھائی کی دکان میں چھری بنایا کرتے تھے تو اس مناسبت سے سکاکی تخلص[1] رکھا تھا، پھر فغانی رکھا،

اِن کا دیوان ایک لڑائی کے ہنگامے میں ضائع ہو گیا تھا، بھائی کو خط لکھا، کہ جہاں کہیں سے کچھ مل سکے جمع کرو، چنانچہ جگہ جگہ سے تلاش کر کے وہ مجموعہ مرتب ہوا جو آج موجود ہے، لیکن اصل مرتب شدہ دیوان جاتا رہا،

کلام پر رائے — ان کو تمام اہل سخن مجدد فن مانتے ہیں، والہ داغستانی لکھتے ہیں،

بابائے مغفور مجتہد فن تازہ ایست کہ پیش از وے احدی بہ آں روش شعر ناگفتہ و پایہ سخنورے را بجائے رسانیدہ کہ عنقائے اندیشہ پیرامون اونمے تواند پرید اکثر استادان زمان مولانا وحشی یزدی و مولانا نظیری نیشاپوری مولانا ضمیری اصفہانی و خواجہ حسین ثنائی و مولانا عرفی شیرازی و حکیم شفائی اصفہانی و حکیم سیحار کنائی کاشی و مولانا محتشم وغیرہم متتبع و مقلد و شاگرد و خوشہ چین خرمن طرز و روش اونید،

متاخرین کی جو خصوصیتیں ہیں اُن کو ہم تمہید میں لکھ چکے ہیں فغانی کے کلام میں وہ خصوصیتیں متوسط حد تک موجود ہیں، ورنہ اصلی ترقی عرفی، نظیری، شرف قزوینی وغیرہ نے دی ہے، ہم صرف کلام کے نمونے پر اکتفا کرتے ہیں،

---

[1] عرفات اوحدی،

خوبی ہمیں کرشمہ و ناز و خرام نیست　　بسیار شیوہ ہاست بتان را کہ نام نیست

اے کہ مے گوئی چرا جامے بجانے مے خری　　ایں سخن با ساقی ما گو کہ ارزاں کردہ است

طرز ادا کا لطف دیکھو، معترض کو یہ اعتراض تھا کہ شراب ایسی کیا چیز ہے جو جان کے عوض میں خریدی جائے، لیکن اس نے اختصار کے لئے صرف اس قدر کہا کہ تم ایک پیالہ جان کے عوض میں کیوں خریدتے ہو، مے خوار شراب کے لطف کا اس قدر گرویدہ ہے کہ وہ یہ سمجھا کہ اعتراض اس پر ہے کہ شراب اتنی ارزاں کیوں خریدتے ہو، اس کی قیمت تو جان سے بڑھ کر کوئی چیز دینی چاہئے، اس کا جواب دیتا ہے کہ میں کیا کروں، یہ اعتراض تو ساقی پر کرنا چاہئے اُس نے قیمت گھٹا کیوں دی،

بہ گفتن من شد ہنر حاسد منکر　　صد شکر کہ عیبم ہنر بے ہنراں است

خراب آں کمر نازکم کہ چوں مہ نو　　بہ شیوہ ہائے بلند از میان زین پیدا است

ساقی مدام بادہ باندازہ مے دہد　　ایں بیخودی گناہ دل زود مست ماست

آں کہ ایں نامہ بسر لبنہ نبشت است نخست　　گرہے سخت بسر رشتۂ مضمون زدہ است

مشکل حکایتے ست کہ ہر ذرہ عین اوست　　اما نمے تواں کہ اشارت بہ او کنند

بروں خرام کہ بسیار شیخ و دانشمند　　خراب آں شکن طرہ و بنا گوش شوند

مقصود صحبت است ز گل، ورنہ بوئے گل　　انصاف اگر بود ز صبا مے تواں شنید

آلودۂ شراب مغانی بہ خاک رفت　　آہ ار ملائکش کفن تازہ بو کنند

تا مے تواں شکست دل دوستاں مخواہ　　کیں خانہ را بہ کعبہ مقابل نہادہ اند

درماندۂ صلاح و فسادیم الحذر　　زیں رسمہا کہ مردم عاقل نہادہ اند

باآه وناله گرچه سرآمد زمان وصل   از نقد عمر آں دو نفس درحساب بود

ہزاراں چاره ضائع گشت دیگر دم نشد ساکن   کنوں درد دگر از پہلوے ہر چارۂ دارم

تواے گل بعد ازیں باہر کہ میخواہی دلت بنشین   کہ من چوں لاله باداغ جفایت زین چمن رفتم

دلے میباید وصبرے کہ آرد تاب دیدارش   فغانی گر دلے داری تو باش ایں جا کہ من رفتم

از فریب نقش، نتوان خامہ نقاش دید

ورنہ دریں سقف نگین جز یکے دگار نیست

ملک الشعرا فیضی

تولد سنہ ۹۵۴ ہجری، وفات ۱۰ صفر سنہ ۱۰۰۴ ہجری

فارسی شاعری نے چھ سو برس کی وسیع مدت میں ہندوستان میں صرف دو شخص پیدا کئے، جن کو اہل زبان کو بھی چاروناچار ماننا پڑا، خسرو اور فیضی، میرزا صائب فیضی کی طرح پر غزل کہتے ہیں، اور مقطع میں کہتے ہیں،

این آں غزل کہ فیضی شیریں کلام گفت ۔۔۔ در دیدہ ام خلیدۂ و در دل نشستۂ

علی نقی کمرہ، ایران کے مشہور شاعر نے ایک قصیدہ ۳۵ شعروں کا فیضی کی طرح میں اصفہان سے لکھ کر بھیجا، جس کے چند شعر یہ ہیں[۱]،

مرا فگند بر نظم امورم پر تو فیضی ۔۔۔ ابو الفیض آں گزین اکبر و شیخ کبیر من

اگر ہستم مجیر اندر سخن او ہست خاقانی ۔۔۔ و گر من مستجیر آستانِ او مجیرِ من،

کیم با او رسد در شاعری دعوے ہمچشمی ۔۔۔ کہ در ایں خانقاہم من مرید و اوست پیرِ من

افسوس یہ ہے کہ شاعری کی شہرت نے فیضی کے اور تمام کمالات پر پردہ ڈال دیا، وہ کہتا ہے اور سچ کہتا ہے،

امروز نہ شاعرم حکیمم ۔۔۔ دانندۂ حادث و قدیمم

لیکن شاعری کی شہرت عام اور تصنیفات علمی کی گم شدگی نے اس دعوی کو بے دلیل کر دیا، فیضی کے مذہبی اور علمی خیالات کا برائے نام کچھ پتہ چلتا ہے تو ان اتہامات سے

[۱] سرو آزاد،

جو بدایونی نے نہایت بے دردی سے اُس پر لگاتے ہیں، تاہم ایک نکتہ دان کو اس غلط اور جھوٹی تصویر میں بھی، اصلیت کے خط و خال نظر آتے ہیں، لیکن ابھی ان بحثوں کے چھیڑنے کا موقع نہیں، ابھی اُس کے سرسری حالات زندگی سننے چاہئیں،

فیضی عربی النسل ہے، اسلاف، یمن میں رہتے تھے، شیخ موسیٰ جو فیضی کی پانچویں پشت میں ہیں، وطن سے ترک تعلق کرکے سیاحت کو اُٹھے، اور چلتے پھرتے سندھ کے علاقے میں آئے، ریل ایک قصبہ ہے، یہاں قیام کیا، اور شادی کر لی، دسویں صدی ہجری میں شیخ خضر، فیضی کے دادا وطن چھوڑ کر ناگور میں آئے، یہاں ایک عربی خاندان میں شادی کی، جس سے شیخ مبارک پیدا ہوئے فیضی اسی نخل کمال کا نونہال تھا شیخ مبارک بڑے پایہ کا شخص تھا، علوم ظاہری اور باطنی دونوں میں کمال رکھتا تھا، چار جلدوں میں تفسیر کبیر کے انداز پر ایک تفسیر لکھی، جس کا نام منبع العیون رکھا، نہایت سیر چشم اور قانع تھا، شیر شاہی حکومت میں سلطنت کی طرف سے جاہ و عزت کی ترغیبیں دلائی گئیں، لیکن اُس کی چشم استغنا نے نظر اُٹھا کر نہ دیکھا، ان کے مفصل حالات، ابوالفضل نے آئین اکبری میں لکھے ہیں،

شیخ مبارک، ناگور سے گجرات اور گجرات سے آگرہ میں آئے، جمنا کے کنارے میر رفیع الدین حسینی کے ہمسایہ میں قیام اختیار کیا، اور یہیں ایک معزز خاندان میں شادی کی، خدا نے کثرت سے اولاد دی، جن میں سب سے پہلا فیضی تھا جو ۹۵۴ھ میں پیدا ہوا، فیضی نے ابتدائی اور انتہائی تعلیم باپ سے حاصل کی،

بدایونی نے خواجہ حسین مروی کے حال میں لکھا ہے کہ فیضی اُس کا تربیت یافتہ تھا خواجہ حسین مروی، شیخ علاء الدولہ سمنانی کے خاندان سے تھے، معقولات میں ملا عصام الدین

کے شاگرد تھے، دینیات، شیخ ابن حجر مکی سے حاصل کی تھی، شاعری انشاپردازی، حسن تقریر، اور ظرافت ولطیفہ گوئی میں کمال رکھتے تھے، اکبر کے حکم سے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ نظم میں کرنا شروع کیا تھا، ۹۷۹ھ ہجری میں وفات پائی فیضی نے دام ظلہ سے مادہ تاریخ نکالا،

بدایونی نے یہ نہیں لکھا کہ فیضی نے کس فن میں ان سے تربیت پائی تھی، لیکن غالباً یہ شاعری کا فن ہوگا، شباب کو پہنچا تو اس کا دامن کمالات کے پھولوں سے بھرا تھا لیکن قسمت نے مدتوں عجیب عجیب مصیبتوں میں مبتلا رکھا، جس کی داستان نہایت المنی ہے لیکن چونکہ دلچسپ بھی ہے اس لئے بالکل قلم انداز بھی نہیں کرسکتا،

شیخ مبارک کو وسعت نظر اور ہمہ دان ہونے نے تقلید اور تعصب کی بندشوں سے آزاد کردیا تھا، خود حنفی تھا، لیکن شیعی، سنی، مسلمان، کافر سب سے ملتا تھا، اس زمانے میں مہدوی فرقہ نہایت مطعون خلایق تھا، شیخ کو ان سے ملنے میں بھی دریغ نہ تھا، عوام میں شہرت پھیلی کہ شیخ رافضی ہے، مہدوی ہے، دہری ہے، سوء اتفاق یہ کہ اسی زمانے یعنی ۹۷۴ھ ہجری میں کہ اکبر کی سلطنت کا چودھواں[1] برس تھا شیخ گوشہ عزلت سے نکل کر، افادۂ عام کی مسند پر بیٹھا، اکبر اس زمانے تک متعصب مولویوں کے قبضے میں تھا، اس کے بل پر درباریوں کو شیخ کے ستانے کا موقع ملا، ان میں سے ایک شخص آدھی رات کے وقت ہانپتا کانپتا فیضی کے پاس آیا، کہ امرائے دولت سب کے سب آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہیں، مصلحت یہ ہے کہ شیخ کو لے کر کہیں نکل جایئے، جب یہ فتنہ

[1] آئین اکبری میں یہی سنہ ہے، لیکن تعجب ہے کہ خود ابوالفضل نے اکبرنامہ میں فیضی کے اول مرتبہ دربار میں پہنچنے کو بارہویں سال کے واقعات میں بیان کیا ہے،

فرو ہو جائے تو پھر اختیار ہے، فیضی گھبرایا ہوا باپ کے پاس آیا، شیخ مبارک نے بڑے استقلال سے جواب دیا کہ میں جگہ سے نہیں ہلتا، جو ہونا ہے ہوگا، لیکن فیضی اس قدر حواس باختہ تھا، کہ تلوار نکال کر کہا آپ کو اختیار ہے، چلیے یا نہ چلیے، میں تو اپنے آپ کو ہلاک کئے ڈالتا ہوں،

باپ کو محبت نے مجبور کیا، ابوالفضل کو سوتے سے جگایا، تینوں باپ بیٹے گھر سے نکل کھڑے ہوئے، لیکن کچھ معلوم نہ تھا کہ کہاں جاتے ہیں، چلتے چلتے فیضی کو ایک آشنا کا خیال آیا، اُس کے گھر پہنچے، وہ اِن لوگوں کو دیکھ کر سخت گھبرایا، مکان کے اندر گئے تو وحشت کدہ دیکھا، وہاں سے بھی چل کھڑے ہوئے، ابوالفضل نے واپس چلنے کی رائے دی، لیکن فیضی نے نہ مانا، ایک شخص کا نام لیا کہ اُس کے ہاں ضرور امن ملے گا، غرض اُس کے گھر پہنچے، اُس نے نہایت گرمجوشی کا اظہار کیا، دو دن تک یہاں ٹھہرے، اُدھر مخالفوں نے اکبر کو برہم کر کے فرمان شاہی صادر کرایا تھا کہ شیخ مبارک کا سارا خاندان دربار میں حاضر کیا جائے، شاہی چوب دار شیخ مبارک کے گھر پہنچے، اور چاروں طرف پہرے بیٹھ گئے،[1] ابوالخیر، فیضی کا چھوٹا بھائی گھر میں تھا، اس کو پکڑ کر بادشاہ کے سامنے لے گئے، شیخ کے دشمنوں کو اکبر کے بھڑکانے کا موقع ملا کہ شیخ کے دل میں چور نہ ہوتا، تو روپوش کیوں ہو جاتا، اکبر کو مخالفوں کی سختی اور جوش انتقام دیکھ کر رحم آیا، درباریوں سے کہا، ایک غریب گوشہ نشین کی جان کا دشمن بننا کیا ضرور ہے شیخ اکثر سیر کو نکل جاتا ہے، اس وقت بھی کہیں چلا گیا ہو گا، اس بیچارے لڑکے (ابوالخیر) کو کیوں پکڑ لائے ہو، غرض ابوالخیر چھوڑ دیا گیا، اور پہرا بھی اُٹھ گیا،

[1] اکبر نامہ میں اس واقعہ کی تاریخ ۱۰ ربیع الاول ۹۸۴ھ ہجری بیان کی ہے،

دشمنوں نے اب بادشاہ کی زبان سے جھوٹی خبریں مشہور کرنی شروع کیں، کہ شیخ مبارک اور فیضی معتوبان بارگاہ ہیں، چند روز کے بعد صاحب خانہ نے بے اعتنائی شروع کی، شیخ کو کھٹکا ہوا، کہ خود صاحب خانہ کہیں پکڑوا نہ دے، رات کو بے سروسامانی کے ساتھ وہاں سے نکلے، اتفاق سے ایک شاگرد راہ میں مل گیا، اُس نے لے جاکر مہمان رکھا لیکن اُس کی طرف سے بھی اطمینان نہ تھا، بالآخر یہ رائے ٹھہری کہ اُس شہر سے نکل جانا چاہیئے، فیضی بھیس بدل کر نکلا اور ایک امیر کے پاس جس سے قدیم ملاقات تھی گیا، اُس نے میزبانی کو اپنا فخر سمجھا، کچھ ترک جوان ساتھ کردیئے کہ شیخ کو ساتھ لائیں، آدھے بجے فیضی نے جاکر باپ بھائی کو یہ مژدہ سنایا، سب نے بھیس بدلے اور غیر معروف راستوں سے امیر کے پاس پہنچے، دس دن تک یہاں اطمینان سے گذرے، لیکن دشمنوں نے امیر کو دربار میں پکڑوا بلایا، مجبوراً یہاں سے بھی نکلنا پڑا، چلتے چلتے ایک باغ نظر آیا ٹھہر گئے کہ ذرا آرام لے لیں، بدقسمتی سے جاسوسوں کا ایک گروہ، جو شیخ کی تلاش میں ہر طرف پھرتا تھا، باغ کے پاس اُترا ہوا تھا، یہاں سے بھی گھبرا کر نکلے، راستہ میں ایک باغبان نے پہچانا اور دلدہی کرکے اپنے گھر لے گیا، باغبان کا آقا باہر سے آیا، تو اُس نے شیخ سے شکایت کی کہ میرے ہوتے آپ نے کیوں اس قدر تکلیف اُٹھائی، چونکہ شیخ کے قیافے سے بے اطمینانی ظاہر ہوتی تھی، اُس نے چور گھر میں لے جاکر رکھا کہ آپ اطمینان سے رہیے، مہینے سے کچھ اوپر یہاں قیام کیا،

چونکہ اکبر اس زمانے میں فتحپور میں رہتا تھا، فیضی آگرہ سے فتحپور گیا کہ ان مصیبتوں سے بچنے کی کوئی تدبیر نکالے، لیکن قسمت کی گردش یہاں بھی ساتھ تھی، فیضی نے جب اپنی مظلومی کی داستان سُنائی، تو درباریوں میں سے ایک نیک دل امیر کو اس قدر جوش آیا کہ

اسی وقت اُٹھا اور دربار میں بغیر اس کے کہ شاہی آداب بجالاتے، گستاخانہ لہجے میں کہا، کہ اس ظلم کی کچھ انتہا ہے، اکبر نے کہا خیر ہے؟ امیر نے کیفیت واقعہ بیان کی، اکبر نے کہا تم کو خبر بھی ہے؟ تمام علما نے فتوے تیار کئے ہیں، اور مجھ کو چین لینے نہیں دیتے کہ جہاں سے ہو شیخ مبارک کا خاندان ڈھونڈھ کر پیدا کیا جائے، اور اُس کو سزا دیجائے، مجھ کو شیخ کا قیام گاہ معلوم ہے، دیہ کہہ کر اکبر نے خاص چور محل کا پتا دیا، جہاں شیخ کا قیام تھا لیکن دانستہ ٹالتا ہوں، کل کوئی جا کر شیخ کو دربار میں لائے،

فیضی یہ واقعہ سُن کر سخت گھبرایا، راتوں رات گرتا پڑتا باپ کے پاس آیا، اُسی وقت سب نے بھیس بدلے، اور گھر سے نکلے، جس مصیبت اور پریشانی میں گھر سے نکلے ہیں، اُس کی تصویر ابوالفضل نے ان لفظوں میں کھینچی ہے،

نورستان آفتاب وتاریک ہائے بدگوہر، و ہجوم مسالک شہر، وہنگامہ پژوہندگانِ نافرجام، ودیاورناپدید، وباراندازنایافت، قلم چوبین راچہ یارا کہ قدرے ازان حال گزارد،
مزدورہ

غرض ایک ویرانے میں جا کر پناہ لی، چونکہ یہ معلوم ہوچکا تھا کہ بادشاہ اپنی ذات سے مہربان ہے۔ اس لئے یہ رائے ٹھہری کہ پائے تخت میں چل کر بادشاہ تک رسائی کے سامان پیدا کئے جائیں، ایک امیر سے پُرانی ملاقات تھی، اُس کے پاس گئے، اُس نے کہا کہ پہلے آتے تو معاملہ آسان تھا، اب حضور کے دل میں بھی رنج آگیا ہے، یہاں رہنا کسی طرح مناسب نہیں، یہ کہہ کر گاڑی منگوائی اور اُس میں بٹھا کر ایک گانوں میں بھجوادیا، وہاں پہنچکر معلوم ہوا کہ گانوں کا رئیس اس خاندان کا قدیمی دشمن ہے، غرض یہاں سے بھی نکلے، اور ایک اور گانوں میں پہنچے،

یہاں بھی ایک مفسد کا سامنا ہوا، اب پھر پھرا کرآ گرے میں آئے اور ایک دوست کے گھر ٹھہرے، دو مہینے تک یہاں قیام رہا، صاحب خانہ نیک دل اور نیک طینت تھا، اور چند لوگ بھی شیخ کے طرفدار پیدا ہو گئے، دربار شاہی میں تقریب ہوئی، ۹۷۴ھ ۱۲ جلوس میں اکبر نے بڑے احترام سے بلایا، ابوالفضل کی طبیعت میں اس وقت تک نہایت آزادی اور بے پروائی تھی، اُس نے دربار میں جانے سے انکار کیا، فیضی گئے اور شاہانہ نوازش سے بہرہ یاب آئے۔[1] آئین اکبری میں اس موقع پر پہنچکر ابوالفضل پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوتی ہے اور بے اختیار یہ رباعی اس کی زبان سے نکلتی ہے،

اے شب نہ کنی آں ہمہ پرخاش کہ دوش | رازِ دل من چنان مکن فاش کہ دوش
دیدی چہ دراز بود دوشینہ شبم | ہاں اے شب وصل آں چنان باش کہ دوش

فیضی جس شان سے دربار میں پہنچا ہے، شہنشاہ نے جس طرح اُس کی قدر افزائی کی ہے، حاسدوں نے جس نگاہ رشک سے اس کو دیکھا ہے، دربار کی جو خدمتیں اُس کو سپرد ہوئی ہیں، اِن سب حالات کو فیضی نے ایک قصیدے میں لکھا ہے، ہم اس کے جستہ جستہ اشعار اس موقع پر نقل کرتے ہیں،

سحر نوید رسان قاصد سلیمانی | رسید ہمچو سعادت کشادہ پیشانی
مبشرانِ سعادت ندا کنان، کہ بخوان | نجات نامۂ خود اے حزینِ ندانی
مرا نظارہ اش از دور، بیقراری داد | چہ بیقراری باصد قرار ارزانی

---

[1] یہ تمام تفصیل آئین اکبری میں ہے تعجب یہ ہے کہ ابوالفضل نے فیضی کے پہلی مرتبہ دربار میں پہنچنے کے تذکرہ میں ان واقعات کو لکھا ہے، لیکن اس قدر اختصار کیا ہے کہ واقعہ کی صورت بدل گئی ہے، اور بعض بعض بات میں دونوں بیان مختلف اور متناقض معلوم ہوتے ہیں،

به بوسه کردم پایش فگار، ازان غافل — که کار گردد دشوار در قدم رانی
شدم سوار تُنک گام توسنے چالاک — که کردی از سرِ دانش سپهر جولانی
خبر ببارگہ شہریار رشد کاینک — رسید بر درِ فردوس مرغ بستانی
خطاب شد که تلطف کنان رسانندش — به آسمانِ سعادت زتیرہ ظلمانی
نخست بوسه زدم خاک آستان یعنی — به چشمه سار رساندم (لب) شفاه عطشانی
اشاره رفت که در پیش گاه مجلس اُنس — شگفته دل بنشینی و شوق بنشانی
به پیش پایهٔ اورنگ شاہنشہ نشستم — زبان ناطقه لب ریز در ثنا خوانی
بگونه گونه تفقد شہنشہم بنواخت — که پایه پایه فرود آمدم زحیرانی
حدیثِ من بشہنشاہِ بنده پرور بود — چو با خدا اے، کلام کلیم (استغفر الله) عمرانی
بگفت خیز و علم از قلم بکش کاین روز — مُسلّم است ترا کشور سخن رانی
زبان بنکته بجنبان که در بدائع نظم — **فرزدقی بتوارزانی ست وحسّانی**
رسید حکم که از نکته سنجی شعرا — به عرض تا برسان آں قدر که بتوانی
زبان وری که دگر با تو در سخن پیچد — سزد بدست ادب گردنش به پیچانی
چه گویم آں که زلطفش چه طرف بر بستم — زهر چه لازمه خانی است وترخانی (ایک لقب ہے)

یہ تمام داستان (قصیدہ کو چھوڑ کر) **ابوالفضل** نے آئین اکبری کے خاتمہ میں لکھی ہے لیکن اس تصریح کو دانستہ قلم انداز کر گیا، کہ **شیخ** کے خاندان پر یہ تمام آفتیں کس کی بدولت آئیں؟ اور دربار کے تقرب کا سبب کون ہوا؟ اس کے علاوہ ابوالفضل کے بیان سے یہ بھی نہیں کھلتا کہ اس قدر مخالفت اور کینہ پروری کے اسباب کیا تھے؟ اس لئے ان ابہامات کی تفصیل ذیل میں کی جاتی ہے،

اکبر کے ابتدائی دور میں دو شخص مذہبی حیثیت سے نہایت جاہ واقتدار رکھتے تھے مخدوم الملک، اور شیخ عبد النبی، مخدوم الملک کا نام عبد اللہ انصاری ہے، شیر شاہ نے اپنے عہد سلطنت میں ان کو صدر الاسلام کا خطاب دیا تھا، سلیم شاہ ان کو اپنے تخت پر بٹھاتا تھا، ہمایون نے شیخ الاسلام کا خطاب دیا تھا، بیرم خان نے لاکھ روپے سالانہ تنخواہ مقرر کی تھی، [1]

شیخ عبد النبی جو شیخ عبد القدوس گنگوہی کے نواسے تھے، صدارت پر ممتاز تھے، یعنی جس قدر مذہبی اوقاف اور جاگیریں تھیں، سب کا انتظام ان کے ہاتھ میں تھا، انہوں نے اکبر کو اس قدر اپنا گرویدہ کیا تھا کہ اکبر ان کے گھر پر جاکر ان سے حدیث پڑھتا تھا، ان کے فیض صحبت سے اکبر کی مذہبی خود رفتگی کی یہ نوبت پہنچی کہ اپنے ہاتھ سے مسجد میں جھاڑو دیتا تھا،

ایک دفعہ سالگرہ کی تقریب میں اکبر نے کپڑوں پر زعفران کا رنگ چھڑکا، شیخ عبد النبی نے دیکھا تو اس قدر برہم ہوئے کہ لکڑی اٹھا کر ماری، اکبر کو ناگوار ہوا، محل میں جاکر مریم مکانی (اکبر کی والدہ) سے شکایت کی کہ بھرے دربار میں ذلیل کرنا مناسب نہ تھا، مریم مکانی نے کہا کہ بیٹا دل پر میل نہ لانا، یہ نجات اخروی کا سبب ہے، قیامت تک چرچا رہے گا کہ ایک مفلوک الحال نے بادشاہ کے ساتھ یہ برتاؤ کیا، اور اس نے برداشت کیا، [2]

یہ دونوں بزرگ جس قدر دیندار تھے، اسی قدر جاہلانہ تعصب رکھتے تھے، جیسا کہ عام طور پر دینداری کا مقتضیٰ سمجھا جاتا ہے، ان لوگوں نے اکبر کو آمادہ کیا کہ ملک میں جو

[1] مآثر الامرا، تذکرہ مخدوم الملک،

[2] مآثر الامرا، جلد دوم، صفحہ ۵۶۰، حالات شیخ عبد النبی، صدر الاسلام،

بدعقیدہ لوگ ہیں، ان کا استیصال کر دیا جائے، چنانچہ عام دار و گیر شروع ہوئی، اور بہت سے لوگ قتل اور قید کیے گئے، مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی نے اکبر سے کہا کہ شیخ مبارک بھی بدعتی ہے، اس کو سزا ملنی چاہئے، چنانچہ اُسی وقت محتسب متعین ہوئے کہ شیخ کو پکڑ لائیں شیخ گھر میں نہ تھا اس کی مسجد کا منبر توڑ کر چلے آئے،[1]

ایک دفعہ ایک مجلس میں شیخ عبد النبی (یا مخدوم الملک (ابو الفضل نے آئین اکبری میں صاف نام نہیں لیا، بلکہ لکھا ہے کہ سر آمد فتنہ جویان) سے اس قسم کی سختیوں کے متعلق ابو الفضل سے بحث ہو گئی، ابو الفضل نے دلائل سے ان کو بند کر دیا،

اسی زمانہ میں یا اس سے کچھ پہلے فیضی شیخ مبارک کو ساتھ لیکر شیخ عبد النبی کے پاس گیا، اور اپنی شکستہ حالی کا اظہار کر کے کچھ مدد معاش کی درخواست کی شیخ نے شیعیت کا الزام لگا کر، نہایت ذلت کے ساتھ نکلوا دیا،[2]

اب یہ دونوں بزرگ اس خاندان کے استیصال پر آمادہ ہوتے، علما سے فتوے لے کر جاسوس متعین کیے کہ شیخ کو ڈھونڈھ لائیں، تمام ملک میں مشہور کرا دیا کہ شیخ کے خاندان کے لئے دربار سے قتل کا حکم ہو چکا ہے شیخ نے پہلے شیخ سلیم چشتی کی خدمت میں التجا کی کہ میری جان بچایئے، شیخ سلیم نے کچھ زاد راہ بھیج کر کہلا بھیجا کہ سر دست مصلحت یہی ہے کہ کہیں نکل جایئے، یہاں سے ناامیدی ہوئی تو میرزا عزیز کے پاس گیا، مرزا عزیز کی ماں کا دودھ اکبر نے پیا تھا، اس لئے وہ اکبر کی خدمت میں نہایت گستاخ تھا، ابو الفضل

---

[1] بدایونی، صفحہ ۱۹۸،

[2] مآثر الامرا، جلد دوم، صفحہ ۵۷۵ و ۵۷۶،

[3] بدایونی صفحہ ۱۹۹،

نے آئین اکبری میں جو لکھا ہے کہ ایک امیر نے اکبر کے سامنے نہایت گستاخانہ سفارش کی، اس سے مرزا عزیز ہی مراد ہے، مرزا عزیز نے بارہا اکبر کو سردربار سخت سُست کہا اور اکبر یہ کہہ کر چُپ ہو جاتا تھا کہ کیا کروں میرے اور عزیز مرزا کے بیچ میں دودھ کا دریا حائل ہے، (دودھ بھائی ہونے کا یہ پاس ہوتا تھا) میرزا عزیز ہی کے توسل سے فیضی کے خاندان کو دربار میں رسائی ہوئی،

اکبر مخدوم الملک اور شیخ عبد النبی کی تنگ خیالیوں سے تنگ آچکا تھا اور ان لوگوں کے زور کو گھٹانا چاہتا تھا، لیکن خود جاہل تھا اس لیے مذہبی فتووں کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا، فیضی اور ابوالفضل دربار میں پہنچے تو اکبر کو گویا اوزار ہاتھ آگئے، ان لوگوں نے ہر موقع پر ان متعصبوں کو شکستیں دیں، اور ان کا سارا بھرم کھل گیا، چنانچہ تفصیل اس کی آگے آئے گی،

فیضی کا تقرب روز بروز بڑھتا گیا، لیکن اُس نے دربار کی کوئی خدمت اختیار نہ کی، طبیب تھا، مصنف تھا، شاعر تھا، اور اُنہیں مشغلوں میں بسر کرتا تھا، شہزادوں کی تعلیم وتربیت کا کام بھی اس سے متعلق تھا، چنانچہ ۲۴ سنہ جلوس میں شہزادہ دانیال کی تعلیم وتربیت سپرد ہوئی، اور تھوڑے ہی دنوں میں فیضی نے اس کو ضروری مراتب سکھا دیئے[1] جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے کہ شہزادہ دانیال ہندی (برج بھاکا) کی شاعری سے واقف تھا اور خود بھی کہتا تھا، یہ فیضی ہی کی صحبت کا اثر ہوگا، اسی سنہ میں اکبر نے اجتہاد واقامت کے دعوے سے مسجد میں جاکر خطبہ پڑھا، یہ خطبہ فیضی نے لکھا تھا، چنانچہ تفصیل اس کی آگے آئے گی۔

---

[1] اکبر نامہ نولکشوری، صفحہ ۲۲۵، جلد سوم،

۲۵ سنہ جلوس میں اکبر نے اظہار عقیدت کے لئے شہزادۂ دانیال کو اجمیر کی زیارت کے لیے بھیجا تو فیضی کو بھی اس کے ساتھ متعین کیا۔

اکبر نے شیخ عبد النبی کا زور توڑ کر صدارت کے ٹکڑے کر دیئے تھے، چنانچہ ۹۹۰ سنہ ہجری میں آگرہ، کالنجر اور کالپی کی صدارت فیضی کو دی گئی ۹۹۳ سنہ ہجری ۳۰ جلوس میں جب یوسف زئی پٹھانوں پر اکبر نے فوجیں بھیجیں تو فیضی بھی اس مہم پر مامور کیا گیا،

۹۹۶ سنہ ہجری میں جو اکبر کی تخت نشینی کا تینتیسواں سال تھا فیضی کو ملک الشعرآ کا خطاب ملا، عجیب اتفاق یہ کہ اس سے دو ہی تین دن پہلے فیضی نے ایک قصیدہ لکھا تھا

آں روز کہ فیض عام کردند ۔۔۔ مارا ملک الکلام کردند

از بہر صعود فکرت من ۔۔۔ آرایش ہفت بام کردند

مارا بہ تمام در ربودند ۔۔۔ تا کار سخن تمام کردند

۹۹۷ سنہ ہجری میں اکبر نے کشمیر کا سفر کیا تو فیضی بھی ساتھ تھا، قصیدہ کشمیریہ اسی سفر میں لکھا ہے جس کا مطلع یہ ہے،

ہزار قافلۂ شوق مے کند شبگیر ۔۔۔ کہ بار عیش کشاید بہ خطۂ کشمیر

دکن کی حکومتوں کو جب اکبر نے فتح کرنا چاہا، تو ۳۶ سنہ جلوس مطابق ۹۹۹ سنہ ہجری میں پہلے ایک ایک کے پاس سفارتیں بھیجیں خاندیس کی سلطنت کا فرمانروا، راجہ علیخاں تھا فیضی کو اس کی سفارت پر متعین کیا، فیضی کو اگرچہ یہ خدمت ناگوار تھی، لیکن قبول کرنے کے سوا چارہ نہ تھا، اس نے سفارت کے معاملات اس خوبی سے انجام دیئے کہ راجہ علیخان نے حلقہ بگوش بن کر آنے کی اطلاع دی، فیضی نے برہانپور میں دربار آراستہ کیا، تخت پر شاہی تلوار، خلعت اور فرمان شاہی رکھا گیا، راجہ علی خان دور سے پیادہ ہوا،

تخت کے قریب آکر، جوتیاں اُتاریں، کھڑے ہو کر تین تسلیمیں بجالایا فیضی نے فرمان شاہی دونوں ہاتھوں میں ادب سے لے کر کہا کہ حضور نے تمہارے نام فرمان بھیجا ہے، راجے علی خان نے فرمان دونوں ہاتھوں سے تھام کر سر پر رکھا اور تین تسلیمیں بجالایا، اسی طرح خلعت اور تلوار عطا کیے جانے پر تسلیمیں کیں، چنانچہ فیضی نے اپنی عرضداشت میں یہ تمام امور تفصیل سے بیان کئے ہیں، یہاں کی مہم سے فارغ ہو کر احمد نگر میں برہان نظام شاہ سے ملا، اور سفارت کے مراتب انجام دیئے،

اس سفر میں اصلی خدمت اگرچہ سفارت کا انجام دینا تھا، لیکن فیضی نے ملک کی ایک ایک چیز، پر مبصرانہ نظر ڈالی، اور بادشاہ کو عرضداشت میں مفصل رپورٹ بھیجی، مثلاً راستوں کا کیا انتظام ہے، عہدہ دار اپنی خدمتوں کو کیونکر انجام دیتے ہیں، شہروں میں رفاہ عام کی کیا کیا عمارتیں ہیں، قلعوں کی کیا حالت ہے، زمین کیسی ہے پیداوار کیا کیا ہے، پھل کیا کیا پیدا ہوتے ہیں، صنعت کے کارخانے کہاں کہاں ہیں، چنانچہ اس رپورٹ کے جستہ جستہ فقرے ہم درج کرتے ہیں،

بلوچی کہ بہ فوجداری مقرر شدہ نزدیک بہ تنگی کوہ درمیان لدھیانہ و سرہند جیپیدہ است، دزدانے کہ از کوہ فرود مے آیند، بہ او ہم حق نذری مے دہند، یعقوب بدخشی خدمت فوجداری و عملداری تھانیسر و پرگنات ہر دو لواجبی مے تواند کرد،

چوں بہ دھول پور رسید، سرائے دیدہ از سنگ بغایت رفیع، کہ صادق خان ساختہ، و متصل آں حمام گرمے مے باشد، و باغیے دلکشا مشتمل بر عمارت دلکش، اپسر شاہ رسشید آں جا بود، سیر قلعہ گوالیار نیز کردہ شد،

وسجاول پور خواجہ ایں خویش وو زیر خان بہ رعایا سلوک خوب کردہ وتقاوی دادہ و پرگنہ معمور ساختہ، کارخانہاے پارچہ بافی ترتیب دادہ کہ چیرہ وفوطہ (یعنے لنگی) براے حضرت مے بافتند، برہان پور وحوالی او اندک جاے ست بغایت تنگ، اکثرے بوستان، ہر جا قطعہ زمینے بودہ ومزروع شدہ، از میوہ انجیر خوب مے شود، خربزہ فرنگی لبشاخ درخت بست، لبست دسی، سی خوشہ جنبان ست، خربزہ ہندوستانی ہم ہفتہ باشد کہ رسیدہ،،

یہ تو خاص ہندوستان کے حالات تھے، غیر ملکوں کے بھی ہر قسم کے مفید اور ضروری اور قابل اعتنا حالات بہم پہنچائے، اور عرضداشتوں میں اکبر کو لکھے، مثلاً ایک عرضداشت میں لکھتا ہے،

اب کی چھ جہاز ہرمز سے چلے، خواجہ معناے عمدۃ التجار، عراقی گھوڑے لے کر آرہا تھا، فرنگیوں کا قاعدہ ہے، کہ گھوڑے چھین لے جاتے ہیں، اور جو پسند آتا ہے رکھ لیتے ہیں، تین جہاز، بندرگاہ چول میں سلامت آئے، حسن قلی افشار اور حسین بیگ لشکر نویس جو صفویہ سلطنت کے عہدہ دار ہیں، آستان بوسی کے ارادہ سے آتے ہیں، یہ لوگ اپنے حرم کو بھی ساتھ لاتے ہیں، شاہ عباس صفوی کا سن بیس برس کا ہے، تفنگ اندازی اور چوگان بازی وغیرہ کا شیفتہ ہے، پارسال دو مرتبہ گھوڑے سے گرا، شجاعت اور بہادری اس کے حالات سے ظاہر ہے، ابھی تک کاروبار خود اپنے ہاتھ میں نہیں لئے، فرہاد خاں وکیل، اور حاتم بیگ وزیر اعظم تمام

کاموں کو انجام دیتے ہیں، پارسال عباس نے خراسان پر لشکر کشی کرنی چاہی تھی، ہرات پہنچکر فوج میں طاعون پھیلا، اس لئے واپس گیا،

اسی طرح ایران اور روم کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں، اور جن باتوں کو پالیٹکس سے تعلق ہے، اِن کے ساتھ خاص اعتنا کرتا ہے، ان خطوط کے پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے، کہ وہ کس قدر ملکی معاملات کی تہ تک پہنچتا تھا،

اس عرضداشت میں ملک قمی اور ظہوری کی بھی تقریب اور نہایت تعریف کی ہے اور ان کے عمدہ اشعار نقل کئے ہیں، ان کے علاوہ اور ہر فن کے ارباب کمال کا ذکر کیا ہے، بیچ بیچ میں دلچسپ اور لطیف حکایتیں بھی لکھتا جاتا ہے،

غرض ایک برس آٹھ مہینے چودہ دن اِن اطراف میں رہا، اور سفارت کا کام نہایت خوبی سے انجام دے کر ۱۰۰۱ھ ہجری میں پائے تخت میں آیا،

یہ بات لحاظ کے قابل ہے کہ فیضی کو ملکی معاملات سے کبھی سروکار نہیں پڑا تھا، وہ شاعر اور حکیم تھا اور یہی اُس کا اصلی مذاق تھا، لیکن اُس زمانے میں تعلیم کے طریقے کی یہ خوبی تھی کہ ایک عالم کو جس قسم کی خدمت دے دیجائے اس کو انجام دے سکتا تھا، آج کل کا سا حال نہ تھا کہ مولوی اور عالم، مُردہ شوئی اور جنازہ خوانی کے سوا، اور کسی کام نہیں آسکتے،

۳۹ جلوس ۱۰۰۳ھ میں اکبر نے اصرار کے ساتھ خواہش کی کہ نظامی کے خمسہ کا جواب لکھا جائے، اور نل دمن سے آغاز کیا جائے، چنانچہ فیضی نے نل دمن چار مہینے میں پوری کر کے پیش کی، تفصیل اس کی آگے آئے گی،

اسی زمانے میں فیضی کو دمہ کا عارضہ ہوا، اور بیماری کے آغاز میں یہ رباعی کہی،[1]

---

[1] ماثر الامراء،

دیدی کہ فلک چہ زہرہ نیرنگی کرد | مرغ دلم از قفس شب آہنگی کرد
آں سینہ کہ عالمے درد مے گنجید | تا نیم نفس برآورم تنگی کرد

یہ شعر اکثر زبان پر رہتا تھا،

گر ہمہ عالم بہم آیند تنگ | بہ نہ شود پاے یکے مور لنگ

حکیم مصری اس زمانے کا نہایت مشہور معالج تھا، اس نے بڑی مستعدی سے علاج کیا، لیکن موت کا کیا علاج تھا،[۱] مرنے سے دو دن پہلے غفلت طاری رہتی تھی، اکبر کو خبر ہوئی، اسی وقت پہنچا، فیضی نے آنکھیں کھولیں، اور آداب بجالایا، اکبر نے خدا کو سونپا اور اُٹھ کر چلا آیا،[۲] ابوالفضل نے تیمار داری کے لئے بادشاہ سے چار دن کی رخصت لی، عین نزع کے وقت آدھی رات کو اکبر کو خبر ہوئی، بیقراری کی حالت میں آیا، اور فیضی کا سر ہاتھ میں لے کر دو تین دفعہ پکار کر کہا، شیخ جیو! اکبر اسی لقب سے فیضی کو خطاب کیا کرتا تھا، میں حکیم علی کو علاج کے لئے لایا ہوں، آپ بولتے کیوں نہیں؟ شیخ نے جب کچھ جواب نہ دیا، تو سر سے پگڑی اُتار کر پھینکدی اور ابوالفضل کو تسلی دے کر چلا آیا،[۳] صفر سنہ ۱۰۰۴ھ ہجری میں انتقال کیا،

عام حالات اور اخلاق وعادات

فیضی پر اگرچہ بظاہر شاعری کا احسان ہے کہ آج اُس کو جو شہرت ہے اسی نام سے ہے، لیکن حقیقت میں شاعری ہی نے اس کے تمام کمالات کو مٹا دیا، ملا عبدالقادر بدایونی سے بڑھ کر اس کا دشمن کون ہوگا تاہم اس کا تذکرہ ان لفظوں سے شروع کرتے ہیں،

در فنون جزئیہ از شعر و معما و عروض و قافیہ و تاریخ و لغت و طب و انشا

---

[۱] بدایونی حالات حکیم مصری، [۲] اکبرنامہ، [۳] بدایونی،

عدیل در روزگار نہ داشت،

علوم متداولہ میں سے، اس کو فقہ، مناظرہ، سیاق اور تاریخ و محاضرات سے رغبت نہ تھی، چنانچہ ایک قطعہ میں خود لکھتا ہے،

ایا حریف دریں بزمگاہ فیضی را — گمان مبر کہ زخیل تہی سبویان ست
بکوہ و دشت معانی کہ مرغ پر نزند — بہ چابکیِ تعقّل دو اسپہ پویان ست
مگر مسائلِ فقہ مقلدانِ ہوا — کہ علم حیلہ گران و بہانہ جویان ست
مُشاجراتِ فرائض کہ کس مخوا نا دش — ازو مپرس کہ او علم مُردہ شویان ست
درِ خلاف و جدل ہم بخویشتن نکشود — کہ آں مقدمۂ جنگ تند خویان ست
سیاہ نامۂ اہل سیاق ہم ننوشت — کہ کار تیرہ درونان سخت پویان ست
مدار حرف بتاریخ ہم مدار کہ آں — فسانہاے ملال دروغ گویان ست

ایشیائی درباروں میں خوشامد اور تملق کے بغیر کوئی شخص فروغ نہیں پاسکتا، لیکن فیضی نے علم کی آبرو قائم رکھی، اس نے یہ گوارا کیا کہ باوجود اس قدر تقرب اور ہمنشینی کے اس کا منصب چارصدی سے نہ بڑھا، حالانکہ ابوالفضل اس کا چھوٹا بھائی دونیم ہزاری تھا، لیکن اوروں کی طرح اس نے عزت نفس کو برباد نہیں کیا، صاحب مآثر الامرا فیضی سے خوش نہیں، تاہم فرماتے ہیں،

پیش آمد و مصاحبت شیخ در پیش گاہ خلافت بہ عنوان علم وکمال بود، زیادہ بر چہارصدی منصب نیافت"،

کتب خانہ

شیخ کا اصلی مذاق، علم وفن کی خدمت تھی، کتابوں کا نہایت شایق تھا، ایک گران بہا کتب خانہ جمع کیا تھا جس میں ۴۰۰۶ کتابیں تھیں، اور اکثر خود مصنف کے ہاتھ کی یا اُن کے

زمانے کی لکھی ہوئی تھیں، یہ کتابیں تین قسم کے علوم و فنون پر مشتمل تھیں، طب[1]، نجوم و موسیقی، حکمت[2] و تصوف و ہیئت و ہندسہ، تفسیر[3] و حدیث و فقہ و غیرہ[4]، دوستوں کو اکثر خطوط میں کتابوں کے بہم پہنچانے کی فرمایش کرتا ہے، ایک دوست کو لکھتا ہے،

از کتب حکمت با فسانہا آنچہ بہم رسد بجہت فقیر بگیرند و بہر بہائے کہ باشد،

اجمیر میں ایک دفعہ کسی نے کہا کہ فلاں صاحب نے میر ہزارہ کے ہاتھ سعید ہروی کا دیوان بھیجا ہے، فوراً اُن کے گھر پہنچا، اور کتاب کا تقاضا کیا، امیر خسرو کے تغلق نامہ کا ایک نسخہ ہاتھ آیا، لیکن اوّل و آخر سے ناقص تھا، ایک دوست کو لکھتا ہے،

بہ یکے از خدمتگاران امر فرمایند کہ بہر خطے مسوّدہ نمودہ بجہت بندہ مصحوب حاملان عریضہ فرستند،

فیاضی | نہایت فیاض اور سخی تھا، اہل کمال کے لئے اس کا گھر مہمان سرائے عام تھا، عرفی ایران سے آیا تو اول اسی کا مہمان ہوا اور بہت دنوں تک اس کے گھر پر مقیم رہا، اس کی تفسیر کی تاریخ حیدر معمائی نے سورۂ قل ہو اللہ سے نکالی، تو دس ہزار روپیے صلہ میں دیئے[2]،

درویش پرستی | فقرا اور اہل دل کا نہایت گردیدہ تھا اور اکثر بزرگوں کے مزار پر حاضر ہوتا تھا، خواجہ فریدالدین شکر گنج کی خدمت میں خاص ارادت تھی، ان کے مزار پر جب گیا ہے، تو کئی قطعے لکھے ہیں، ایک یہ ہے،

سفر گزیدہ ترین نعمتے ست در عالم | زبہر ذوق خدا دانی و خدا بینی

---

[1] کتب خانہ کے متعلق یہ تفصیل، بدایونی نے فیضی کے تذکرہ میں لکھی ہے،

[2] مآثر الامرا، ذکر فیضی،

دریں سفر زپے طوفِ اولیاے عظام — کہ بودہ اند شہان در لباس مسکینی

رسید بہر طواف مزار گنج شکر — کہ کردہ زیر سرش نہ سپہر بالینی

بلے چو خوان کرم اہل نعمت آرایند — بروے مائدہ آخر کشند شیرینی

ایک اور قطعہ ہے،

قطبِ بانی فرید الدین شکر گنج آنکہ خلق — در مقام او بہ صد رنج سفر پے بردہ اند

دو تین شعر کے بعد کہتا ہے،

طوطیان دیدیم در پروانہ گرد مرقدش — گوئی اینہا ہم بآں گنج شکر پے بردہ اند

ایک دوست کو لکھتا ہے،

دراحوال ذکر مشائخ ہند، انچہ داشتہ باشند، از ملفوظات وغیرہ ہمہ ہمراہ آرند، البتہ بدست عزیزے کتابے دراحوال مشائخ ہند بود موسوم بہ تذکرۃ الاصفیا، اگر دراں شہر بہم رسد، بہم رسانند، کہ بسیار مطلوب ست،،

رشک وحسد اور ناتوان بینی شعرا کا عام خاصہ ہے، لیکن فیضی تمام معاصرین کا نام نہایت عزت اور محبت سے لیتا ہے، اور دربار شاہی میں اُن کی سفارش کرتا ہے، اکبر کو ایک عرضداشت میں لکھتا ہے،

دراحمد نگر دو شاعر خاکی نہاد صافی مشرب اند و در شعر رتبہ عالی دارند یکے ملک قمی کہ بہ کس کمتر اختلاط مے کند، و ہمیشہ مژہ ترے دارد، دیگر ملا ظہوری کہ بغایت رنگین کلام ست، و در مکارم اخلاق تمام عزیمت آستان بوس دارد،

دونوں کے اشعار بھی نقل کئے ہیں،

ملک قمی کا دیوان اوّل اوّل فیضی ہی دکن سے اپنے ساتھ لایا[۱]، غزالی شاعر مرا تو اُس کی تاریخ کہی،

قدوۂ نظم، غزالی کہ سخن | ہمہ از طبع خدا داد نوشت
عقل، تاریخ وفاتش بدو طور | سنہ نہ صد و ہشتاد نوشت ۹۸۰

عرفی کی نسبت، عام طور پر یہ مشہور ہے کہ فیضی اس سے جلتا تھا، اور دونوں میں ہمیشہ نوک جھوک رہتی تھی، چنانچہ اس قسم کے قصے، خافی خاں اور بدایونی نے بھی نقل کئے ہیں، لیکن فیضی کے مکاتیب موجود ہیں، اس میں ایک دوست کو خط لکھا ہے، اور عرفی کی اس قدر تعریف کی ہے کہ اس سے زیادہ نہیں ہو سکتی، ہم اُس کے خاص الفاظ عرفی کے حال میں نقل کریں گے،

نہایت حلیم اور نیک نفس تھا، ملا عبد القادر بدایونی کا برتاؤ جو اس کے ساتھ تھا، اس کا اندازہ اُن الفاظ سے ہو سکتا ہے جو ملا صاحب نے اس کی نسبت استعمال کئے ہیں چنانچہ اس کے حالات میں لکھتے ہیں،

"مخترع جد و ہزل و عجب و کبر و حقد و مجموعۂ نفاق و خباثت و ریا و حب جاہ و خیلاء و رعونت بود، در وادیے عناد و عداوت با اہل اسلام و طعن در اصل اصولِ دین و اہانتِ مذہب و مذمت صحابہ کرام و تابعین و سلف و خلف متقدمین و متاخرین و مشائخ و اموات و احیاء و بے ادبی و بے تحاشی نسبت بہمہ علما و صلحا و فضلا سرًا و جہارًا لیلاً و نہارًا ہمہ یہود

---

[۱] بدایونی، تذکرۂ ملک قمی،

ونصاریٰ و ہنود و مجوس برو ہزار شرف داشتند،

لیکن فیضی کا سلوک ملا صاحب کے ساتھ یہ تھا۔ کہ ملا صاحب، جب دربار اکبری سے معتوب ہوتے تو ۱۰۰۳؁ ہجری میں اُس نے احمد نگر سے ایک خط اکبر کو لکھا، جس میں ملا صاحب کے کمالات کی بے انتہا تعریف کی، ان کے علمی اور اخلاقی کمالات آٹھ دس سطر میں گنائے ہیں، آخر میں لکھا ہے کہ گویا میں خود حضور کی درگاہ میں حاضر ہو کر نامبردہ کے اوصاف عرض کر رہا ہوں، اور نہ کرتا تو حق پوشی کا مجرم ہوتا، ملا صاحب کی غیرت کی داد دینی چاہیئے کہ خود اس خط کو اپنی کتاب میں نقل بھی کیا ہے، اور چونکہ یہ کھٹکا بھی تھا کہ لوگ کیا کہیں گے اس لئے فرماتے ہیں،

اما چہ توان کرد کہ حق دین وحفظ عہد آں بالاتر از ہمہ حقوق ست، الحب للہ والبغض للہ،

ملا صاحب اور اُن کے تمام پیروؤں نے متفقاً فیضی کو ملحد، بیدین، زندیق اور کافر لکھا ہے، ملا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ فیضی مرنے کے وقت کتوں کی طرح بھونکتا تھا، اور اس کے ہونٹھ سیاہ ہو گئے تھے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ فیضی کے رتبہ کو سمجھ نہیں سکتے تھے وہ جو حکیمانہ خیالات ظاہر کرتا تھا، ان لوگوں کو الحاد اور زندقہ نظر آتا تھا فیضی کے مذہب اور اس کے خیالات سے اس کا دیوان بھرا پڑا ہے، اس کے پاکیزہ خیالات خود اُس کی زبان سے سنو،

ما طائر قدسیم نوا را نشناسیم
مرغ ملکوتیم ہوا را نشناسیم

برہانِ ثبوتیم زما نفی نیاید
از مانعم آموز کہ لا را نشناسیم

در کشف حقایق سبق آموز ضمیریم
ترتیب دلیل حکما را نشناسیم

با اہل جدل نکتۂ توحید نہ گوئیم | در وحدت حق چون و چرا را نشناسیم
اصحاب یقینیم، گمان را نہ پسندیم | ارباب صوابیم، خطا را نشناسیم
از قافلۂ ما نتوان یافت نشانے | رقص جرس و بانگ درا را نشناسیم
نور جبروتیم، ز ظلمت نہ ہراسیم | آئینۂ صبحیم، ہمہ را نشناسیم
شام
بر دانش ما انجم و افلاک بخندند | گر صاحب لولاک لما را نشناسیم
صد شکر کہ ما پیرو اصحاب رسولیم | در شرع، دگر راہ نما را نشناسیم

اس کے بعد چاروں خلفا کے اوصاف بیان کئے ہیں،

بدایونی وغیرہ کہتے ہیں کہ فیضی فلسفہ کو شرع پر مقدم سمجھتا تھا، لیکن وہ خود مرکز ادوار میں لکھتا ہے،

معنی قرآن چو ادا مے کنی | ایں ہمہ تاویل چرا مے کنی
حق ز تو با غیر مشابہ شدہ | پیش تو محکم متشابہ شدہ
فہم تو از قول نبی اجنبی | بے خبر از سر حدیث نبی
چوں سخن از شرع بہ کج مے رود | فکر تو چوں حاشیہ کج مے رود
طعنہ مزن ایں ہمہ بر اختلاف | کز پے تسہیل تو رفت اختلاف
گر ہمیان ور بہ طرف رفتہ اند | راہ چناں رو کہ سلف رفتہ اند
بہر ریاضی بہ ریاضت مکوش | نور الٰہی بہ طبیعی مپوش
از خط اقلیدس و سخطش مگوے | تختۂ اشکال مجسطی بشوے
بگذر ازیں علم و عمل پیش گیر | ترک قوانین جدل پیش گیر

با ایں ہمہ وہ فراخ مشرب اور آزاد خیال تھا، اور جانتا تھا کہ متعصب مولویوں نے

مذہب کی جو صورت بنا رکھی ہے، یہ اسلام کی اصلی تصویر نہیں، شیعہ سُنّی کے جھگڑوں کو وہ اصل مذہب سے غیر متعلق سمجھتا تھا، اور ان خانہ جنگیوں کی ہنسی اُڑاتا تھا، اکبر کی ایک عرضداشت میں لکھتا ہے کہ ایک اُوزبک ترک ہاتھ میں دھاگا لئے پھرتا تھا، لوگوں نے پوچھا یہ کیا ہے؟ بولا کہ میری ماں نے دیا ہے کہ کسی رافضی کے خون سے رنگین کر لا، تو میں رکھ چھوڑوں کہ میرے کفن کے سینے میں کام آئے، اسی عرضداشت میں لکھتا ہے کہ چند احباب ایک حوض کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے، ایک شخص نے کہا کل اسی طرح حوض کوثر کے چاروں کونے پر خلفائے اربعہ تشریف رکھتے ہوں گے، اور مومنین کو آب کوثر پلاتے ہوں گے، ایک شیعہ جس کا نام محمود صباغ تھا، بولا کہ کیا فضول بکتے ہو، حوض کوثر دور ہے اور اس کے ساقی مرتضیٰ علی ہیں، یہ کہہ کر بھاگا، یہ حکایتیں لکھ کر فیضی حضرت خواجہ فریدالدین عطار کے یہ اشعار نقل کرتا ہے،

زنادانی دل پُر جہل و پُر مکر گرفتار علے ماندی و بوبکر
چوں یک دم زین تخیل مے نرستی نمے دانم خدا را کے پرستی

فیضی پر بڑا الزام یہ ہے کہ اس نے اکبر کو لامذہب اور ملحد بنا دیا، اس جھوٹ میں صرف اس قدر سچ ہے کہ ایک زمانے میں شیخ عبدالنبی، اور مخدوم الملک نے اس قدر تعصب پھیلا دیا تھا کہ غیر مذہب کے لوگ علانیہ قتل اور گرفتار کیے جاتے تھے، خود بدایونی کی کتاب میں متعدد واقعات ہیں کہ بہت سے لوگ بدعتی اور رافضی ہونے کے جرم میں قتل کر دیئے گئے، فیضی اور ابوالفضل نے اکبر کی اس تنگ خیالی کی اصلاح کی لیکن عبدالنبی اور مخدوم الملک کا اثر ملک پر اس قدر غالب آچکا تھا کہ ان کا زور توڑنا مشکل تھا، فیضی اور ابوالفضل نے علمی مجلسیں قائم کرائیں، جن میں درباریوں کو علانیہ نظر آیا کہ ان

متعصبوں کے پاس لعن اور تکفیر کے سوا کوئی اوزار نہیں، اس کے بعد ۹۸۷ھ ہجری میں (۲۴ جلوس) ایک محضر نامہ طیار کرایا، جس کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ ظل اللہ ہے، اس کو یہ منصب حاصل ہے کہ مسایل مختلفہ میں جس مجتہد کے قول کو چاہے اختیار کرے، اور وہی حجت ہوگا،، اس محضر کی عبارت شیخ مبارک نے لکھی، اور فیضی اور ابوالفضل نے اس پر دستخط کیے، لطف یہ کہ شیخ عبدالنبی اور مخدوم الملک کو بھی دستخط کرنے پڑے، اکبر نے یہ بھی چاہا، کہ اعلان عام کی غرض سے جمعہ کی نماز بھی پڑھائیے، تاکہ منصب امامت مسلم ہو جائے، فیضی نے خطبہ لکھ دیا،

بنام آں کہ مارا سروری داد   دلے دانا و بازوے قوی داد
بود وصفش ز حدِ فہم برتر   تعالٰے شانہ، اللہ اکبر

ان کارروائیوں نے متعصب مولویوں کا زور توڑ دیا اور اکبر کو موقع ملا کہ وہ ایک ایسی وسیع اور آزادانہ حکومت قائم کرے، جس کے سایہ میں ہندو، مسلمان، یہود نصاریٰ سب آزادی کے ساتھ اپنے اپنے فرائض مذہبی، ادا کر سکیں، اور یہی طرز حکومت خلفاے راشدین نے قائم کیا تھا،

اس میں شبہہ نہیں کہ اکبر اس عالم میں حد سے تجاوز کر گیا تھا، درباریوں نے اس کو بنانا شروع کیا، اور وہ بنتا گیا، وسعت مشرب میں اس نے آتش پرستی اور آفتاب پرستی تک کی، لیکن اس میں فیضی کا کیا قصور ہے، فیضی سے جہاں تک ہو سکا اس نے ہر موقع پر مذہبی پہلو قائم رکھا، یاد ہوگا جب اکبر کے حکم سے ابوالفضل نے توریت کا ترجمہ سنانا شروع کیا اور یہ مصرع پڑھا،

اے نامی وے ژژد کرسٹو، (جنیرس کرائسٹ)

توفیضی برابر سے بولا ع سُبحانک مَاسِوَاکَ یَاھو،

فیضی نے تفسیر، ان واقعات کے بعد لکھی ہے، لیکن ایک ذرہ مسلّماتِ عام کی شاہ راہ سے نہیں ہٹا، حالانکہ تفسیر میں ہر قدم پر اُس کو آزاد خیالی دکھانے کا موقع حاصل تھا ملا صاحب تو فرماتے ہیں کہ وہ تمام عقائد اسلام کا منکر تھا، لیکن وہ اُن تمام عقائد کا معترف نظر آتا ہے جن کو معتقداتِ عوام کہتے ہیں، معراج کی نسبت اکثر علمائے اسلام کا خیال ہے کہ روحانی تھی لیکن فیضی اس پر راضی نہیں چنانچہ کہتا ہے،

رہ راست برو کہ راہ کج نیست	حاجت بہ دلائل و حجج نیست
آں را چہ وقوف ازیں مقام ست	کو منکر خرق والتیام ست

سچ تو یہ ہے کہ فیضی کی مذہبی آزادی ہم جو کچھ سنتے ہیں، زبانی سنتے ہیں تصنیفات میں تو وہ ملائے مسجدی نظر آتا ہے،

فیضی اگرچہ ریاکار مولویوں کو نہایت بُرا سمجھتا تھا، لیکن اصلی مقدس بزرگوں سے نہایت عقیدت رکھتا تھا، شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلوی سے اس کو نہایت خلوص تھا ایک مدت تک فتح پور میں بلاکر ان کو مہمان رکھا، پھر جب دربار کی مذہبی بدنامی پھیلی، تو شیخ دلّی چلے گئے، فیضی نے بار بار بلایا لیکن شیخ نے عذر کیا، بالآخر شیخ نے ایک خط لکھا، جس میں اُن کو آیندہ تکلیف نہ دینے کا اظہار کیا، لیکن یہ بھی لکھا کہ خط و کتابت سے دریغ نہ کیجیے گا، [1] اخیر کے فقرے یہ ہیں،

اگر بال و پرے مے داشتم، ہر روز بر بام آں حجرہ مے نشستم، و دانہ چین نکات محبت مے شدم، دیگر چہ نویسم، مطلب ہائے دردانہ ازاں جا دیر

---

[1] تاریخ بدایونی، تذکرۂ شیخ عبد الحق دہلوی،

مے رسد از برائے خدا برمن قافلۂ اسرار خود راراہ نہ بندند،

ملا صاحب، ان تمام باتوں کو فیضی کی ستم ظریفی سمجھتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ وہ گرمی محفل کے لئے ان بزرگوں کو اپنے یہاں بلاتا تھا،

اس زمانے میں نشانی صاحب ایک مُہرکن ملا صاحب کے ساختہ پرداختہ تھے، وہ فیضی کے عروج کو دیکھ کر سخت جلتے تھے، اور اس کی شان میں ہجو آمیز اشعار کہا کرتے تھے، فیضی نے ایک قصیدہ لکھا تھا،

شکر خدا کہ عشق بتاں ست رہبرم　　برملتِ برہمن و بردین آذرم

اگرچہ فیضی نے اس شعر کے بعد بت اور برہمن کے معنے بتا دیئے تھے کہ متداول معنی مراد نہیں،

بت چیست؟ رُخِ نگاشتۂ معنی مبین　　کاندر کلید ہائے ضمیر ست مضمرم

استاد برہمن کہ زبت خانۂ خیال　　در سجدۂ حضور فرود آورد سرم

لیکن نشانی صاحب، اس لطف کو کیا سمجھ سکتے تھے، انہوں نے اس کی چوٹ پر فوراً ایک قصیدہ لکھ کر ڈالا،

شکر خدا کہ پیرو دین پیمبرم　　حب رسول وآل رسول ست رہبرم

قائل بہ روز حشر و قیام قیامتم　　امیدوار جنت و حوری و کوثرم

یہاں تک بھی غنیمت ہے لیکن ایک مثنوی میں فیضی کے کمال شاعری کا بھی انکار کرتے ہیں،

دعوے ایجاد معانی مکن　　شمع نہ چرب زبانی مکن

طبع تو ہر چند در ہوش زد　　یک سخن تازہ نشد گوش زد

انچہ تو گفتی دگران گفتہ اند | دُر کہ تو سفتی دگران سفتہ اند
خانہ کہ از نظم بیا راستی | آب و گلش از دگران خواستی
تازگی آں نہ ز باران تست | از خوے پیشانی یاران تست
چند پئے نقد کسان سوختن | چشم بہ مالِ دگران دوختن
شربتِ بیگانہ فراموش کن | آب ز سرچشمۂ خود نوش کن
گر خضری آب حیات تو کو؟ | ور شکری شاخ نبات تو کو؟

ملا صاحب نے ان اشعار کو رنشانی کے حال میں، نہایت جوش سے نقل کیا ہے، خود بھی فیضی کے حال میں فرما چکے ہیں کہ چالیس برس تک استخوان بندی کرتا رہا، لیکن ایک شعر مزہ کا نہ نکلا، لطف یہ کہ نلدمن کے ذکر میں خود لکھ چکے ہیں، کہ تین سو برس سے ایسی مثنوی نہیں لکھی گئی، ملا صاحب کی ان دورنگیوں پر بے ساختہ یہ شعر یاد آتا ہے؛

ازاں بہ درد دگر ہر زمان گرفتارم | کہ شیوہ ہائے ترا باہم آشنائی نیست

فیضی کو اپنے خاندان سے نہایت محبت تھی، تفسیر میں کوئی موقع نہ تھا لیکن اپنے آٹھوں بھائیوں کا ذکر کیا ہے، خطوط میں ابوالفضل کو علامی اخوی، نواب اخوی لکھتا ہے اور اس انداز سے لکھتا ہے کہ محبت کا نشہ ٹپکتا ہے، قصیدہ فخریہ میں ابوالفضل کی نسبت لکھتا ہے،

بااین چنیں پدر کہ نوشتم مکارمش | در فضل مفتخر زگرامی برادرم
صد سالہ در میان من و اوست در کمال | در عمر اگر چہ یک دو سہ سالے فزون ترم

۹۹۷ھ ہجری میں اکبر کے ساتھ پشاور میں تھا کہ خبر پہنچی کہ والدہ بیمار ہیں، بادشاہ

کا ساتھ چھوڑ کر لاہور پہنچا، یہاں اُن کا انتقال ہو چکا تھا بے تاب ہو گیا، اس عالم میں جو خط لکھے ہیں، اُن سے خون ٹپکتا ہے، ایک دوست کو لکھتا ہے،

بالفعل حالے دارد کہ بندہ رانمے توان شناخت، بدن درکاہش افتادہ واندوہ کارگر آمدہ، ضعف واسہال روے نمود، ودل از حیات سرد شدہ بخدا اے خدا سوگند کہ از ہزار یکے نوشتہ است،،

تین برس کا بچہ مرگیا ہے۔ اُس کے غم میں جانگداز مرثیہ لکھا ہے،

شد وقت آں کہ دیدہ چو دل غرق خون کنم — خون نابہ گرہ شدہ از دل بروں کنم
آں غصہ کہ پیش نخوردم کنون خورم — واں نالہ کہ پیش نہ کردم کنوں کنم
گویند غافلان رہ صبر اختیار کن — چوں اختیار در کف من نیست چوں کنم
اے روشنی دیدۂ روشن چگونہ — من بے تو تیرہ روز تو بے من چگونہ
ماتم سرا است خانہ من در فراقِ تو — تو زیر خاک ساختہ مسکن چگونہ
برخار وخس کہ بستر وبالین خواب تست — اے یاسمین عذار سمن تن چگونہ

تصنیفات صاحب مآثر الامراء نے لکھا ہے کہ فیضی نے ایک سو ایک کتابیں تصنیف کیں، ان میں سے جن کتابوں کا پتہ چلتا ہے اُن کی تفصیل حسب ذیل ہے،

خمسہ، یعنی نظامی کی پانچوں مثنویوں کا جواب، ان کی تفصیل خود ایک خط میں کی ہے چنانچہ لکھتے ہیں،

اسامی کتب خمسہ این ست، اول مرکز ادوار کہ اکثرے در فتح پور گفتہ شدہ بود، دوم سلیمان و بلقیس کہ پیش ازیں ہفت سال در لاہو بنیاد کردہ بود، و چیزے چند از اں گفتہ، سوم نل دمن کہ تمام شد،

چہارم ہفت کشور کہ دراحوال ہفت اقلیم گفتہ خواہد شد، پنجم
اکبرنامہ کہ آں ہم جستہ جستہ وقتے گفتہ بود،

ان میں سے دو کتابیں یعنی نلدمن اور مرکز ادوار انجام کو پہنچیں اور آج بھی ملتی ہیں، مرکزِ ادوار کی ترتیب شیخ ابوالفضل نے فیضی کے مرنے کے بعد کی، مرکزِ ادوار کا عمدہ نسخہ ہمارے کتب خانہ میں جواب ندوہ پہ وقف کردیا گیا موجود ہے

۳۰ سنہ جلوس میں فیضی کو خمسہ کا خیال پیدا ہوا، اور سب سے پہلے مرکز ادوار شروع کی اس کے ساتھ اور مثنویوں کی بھی بنیاد ڈالی، اور سب کے کچھ کچھ شعر کہے لیکن چونکہ بہت سے مشغلے پیش آتے رہتے تھے، کوئی کتاب انجام کو نہ پہنچ سکی، [1]۳۹ سنہ جلوس ۱۰۰۲ھ میں اکبر نے اصرار کے ساتھ کہا کہ خمسہ کو پورا کرنا چاہئے، اور سب سے پہلے نلدمن انجام پاتے چونکہ ہندوؤں کا قصہ تھا، اکبر کی میلان طبع نے اس کو متقدم رکھا، چنانچہ چار مہینے میں تمام ہوئی چار ہزار شعر ہیں، چنانچہ خود کہتے ہیں،

ایں چار ہزار گوہر ناب کانگیختہ ام بہ آتشین آب

فیضی نے یہ مثنوی اکبر کی خدمت میں پیش کی، اور دستور کے موافق اشرفیاں نذر کیں، اکبر نہایت محظوظ ہوا، اور حکم دیا کہ خوش خط لکھوا کر جا بجا مرقعے اور تصویریں شامل کی جائیں، نقیب خان کو حکم ہوا کہ وہ پڑھ کر سنایا کرے،

ملا عبدالقادر صاحب بدایونی ہر جگہ جہاں فیضی کا ذکر آتا ہے بے نقط سناتے ہیں لیکن یہاں ان کو بھی مجبور ہو کر تعریف کرنی پڑی، چنانچہ فرماتے ہیں،

والحق مثنوی ست کہ دریں سنہ ۳۰۰ صد سال، مثل آں بعد از امیر خسرو،

[1] یہ پوری تفصیل اکبرنامہ واقعات سنہ ۳۹ جلوس میں ہے،

شاید در ہند کسے دیگر گفتہ باشد،

ابوالفضل نے اکبرنامہ میں لکھا ہے کہ سب ثنویاں پوری ہوئیں، لیکن کوئی عینی شہادت پیش نہیں کی، بلکہ فیضی کے اشعار سے استدلال کیا ہے، لیکن جو شعر استدلال میں نقل کئے ہیں، اُن سے یہ ثابت نہیں ہوتا، اشعار یہ ہیں،

زیں ہفت رباط و چار منزل — بندم بہ جمازہ پنج محمل،
آں چار عروس ہفت خرگاہ — کاوردمیان بہ نیمۂ راہ
چندیں اگرم اماں دہد بخت — یک یک ببرم بپایۂ تخت
گر نشکندم سپہر پیمان — بلقیس برم بر سلیمان

نلدمن اور مرکز ادوار پر ریویو آگے آئیگا، سلیمان بلقیس کا یہ انداز ہے،

الٰہی پردۂ تقدیس بکشاے — سلیمانِ مرا بلقیس بنماے
دل من با بتانِ آذری چند — سلیمانے گرفتار پری چند
چنانم از بلندی دردہ آواز — کہ آید ہُدہُد شوقم بہ پرواز
گرہ شد ہفت دریا در گلویم — کشایش نیست ممکن تا نہ گویم
وگر رفتم کہ بگذارم مقابل — شگاف خانہ را با روزنِ دل

اکبر کی مہم گجرات پر ایک مثنوی لکھی تھی وہ بھی ناپید ہے، چند شعر ایک خط میں نقل کئے ہیں، ملاحظہ ہوں،

ہماندم اہالی و حُکّامِ شہر — کہ در شہر بودند مشہور دہر
ہمہ کردہ آویزۂ دست خویش — کلید در گنج شاہان بہ پیش
رسیدند از سر قدم ساختہ — ز شادی سراپائے نشناختہ

سرِ خود نہادند برپاے شاہ　　　　　　کہ مائیم سرتاقدم در گناہ

زعمرے کہ ناکذشتہ دربندگی　　　　　　بصد گونہ داریم شرمندگی

رسیدیم درخدمتت بندہ وار　　　　　　بجز بندگی بندگان راچہ کار

نہایت چُست پھُستی اور رندانہ ترکیبیں ہیں، اس لئے قلم انداز کرتا ہوں،

موارد الکلم، تفسیر غیر منقوط لکھنے کا جب ارادہ کیا، تو مشق کے طور پر پہلے یہ کتاب لکھی کہ ہاتھ صاف ہوجائے، کلکتہ میں چھپ گئی ہے، فیضی کے ایک رقعہ سے معلوم ہوتا ہے، کہ ۹۸۵ھ ہجری کی تصنیف ہے، فیضی نے اس کو بلاد عرب میں بھیجا تھا، اور لوگوں نے حسب دستور اس کو بہت کچھ داد دی،

سواطع الہام، یعنی تفسیر غیر منقوط ۱۰۰۲ھ ہجری میں تمام ہوئی، کل مدت تصنیف دو ڈھائی برس ہے، اس تفسیر پر فیضی کو بڑا ناز ہے، دوستوں کو جو خطوط لکھے ہیں، اُن میں اکثر فخر سے اس کا تذکرہ کرتا ہے، جن لوگوں نے تاریخیں اور تقریظیں لکھیں، اُن کے نام بھی لکھے ہیں، ایک خط میں لکھتا ہے،

در عاشر ربیع الثانی ۱۰۰۲ھ اثنین والف کہ سال حال ست، تمام شد، ایں عطیہ غیبی مخصوص فقیر بود، غرابتش زیادہ ازاں ست، کہ حیرت افزاے اہل ایں فن نہ گردد،

دیباچہ میں لکھا ہے کہ جب ابتدا کی تو والد کو دکھایا، وہ بہت خوش ہوئے اور بعض فقرے بدل دیئے، چھٹا حصہ تمام ہوا، تو اکبر نے فیضی کو دکن کی مہم پر بھیجدیا، اس مہم میں ایک سال سے زیادہ توقف ہوا، اسی اثنا میں شیخ مبارک کا انتقال ہوگیا، پھر تفسیر رُک گئی، اور ایک سال سے کچھ کم رُکی رہی، دوسرے سال کے آغاز میں شروع کی، اور انجام کو پہنچائی، تفسیر خیر جو

کچھ ہے، ہے لیکن تاریخیں اور تقریظیں خوب لکھی گئی ہیں، ملا حیدر کاشانی نے پوری قل ہو اللہ سے تاریخ نکالی، یعنے اس سورۃ کے حرفوں کے عدد شمار کیے جائیں تو ۱۰۰۲ ہوتے ہیں، ایک اور شخص نے اس آیت سے تاریخ نکالی لا رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین ظہوری اور ملک قمی نے قصیدے اور رباعیاں لکھیں، چند رباعیاں درج کرتا ہوں، جن میں غیر منقوط ہونے کی توجیہ شاعرانہ طریقہ سے کی ہے،

دانا سے ازیں دفتر کل دریا شد ۔ پیداست نقاطش زچہ ناپیدا شد
شد وقت حصاد، دانہا خرمن گشت ۔ شد سیر تمام، قطرہ ہا دریا شد

از چین سخن گران سخن نتوان ساخت ۔ بوے بوزید صفحہ مشک افشان ساخت
صیاد خیال از پے آہوے قلم ۔ ہر نافہ کہ چید در بغل پنہان ساخت

ایں نسخہ کہ شاد کرد ناشادان را ۔ رو ساختہ شاگردیِ استادان را
بر نقطہ ز تار خط نیفگند کمند ۔ در بند رواند اشت آزادان را

اے بخت بیا یاری ایں بیکس کن ۔ تا پیش رودم موانع رہ پس کن
ہر نقطہ کہ گردند ازیں نسخہ بروں ۔ شد مہر لب سخن ظہوری بس کن

ایں خردہ چہ خردہا کہ نایاب شدند ۔ ذرات دریں شعشعہ سیماب شدند
از پردۂ لفظ حسن معنی بدمید ۔ خورشید بر آمد، اختران آب شدند

فیضِ ازل از چہرہ برافگند نقاب   از لوحِ خرد استرد آثار حجاب

سر زد خورشیدِ معنی از مشرقِ لفظ   نیلوفر نقطہ سر فرو برد بہ آب

سخت تعجب ہے کہ فیضی جیسے حکیم اور فلسفہ پسند شخص نے کیونکر یہ بیہودہ مغز کاوی گوارا کی، تفسیر کو پڑھ کر بجز اس کے، کہ جا بیجا مہمل الفاظ جمع کر دیئے ہیں، اور کچھ اثر طبیعت پر نہیں ہوتا، یہ سچ ہے کہ اور کوئی شخص اس کمان کو زہ نہیں کر سکتا، لیکن بہر حال ایک لغو کام ہے، کسی سے بن آتے یا نہ آتے، طرہ یہ کہ فیضی کے مخالفین نے اس موقع پر بھی اعتراض کیا تو یہ کیا کہ آج تک کسی نے بے نقط تفسیر نہیں لکھی، اس لئے یہ بدعت ہے اور اس لئے خلاف شریعت ہے، فیضی نے برجستہ جواب دیا، کہ خود کلمۂ توحید لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ محمد رسولُ اللہ، سر تا پا غیر منقوط ہے،

انشاے فیضی، نور الدین محمد عبد اللہ۔ بن حکیم عین الملک، کہ نسلاً ایرانی اور خود ہندوستان زاتھے، فیضی کے بھانجے اور شاگرد تھے، اُنہوں نے فیضی کے تمام مکاتیب وخطوط مہیا کر کے، ایک مجموعہ مرتب کیا، اور لطیفہ فیضی نام رکھا، اس وقت تک خطوط اور مراسلات سے بیان واقعہ کے بجاے زیادہ تر اظہار انشا پردازی مقصود ہوتا تھا فیضی پہلا شخص ہے، جس نے سادہ نگاری کی ابتدا کی، اس طرز میں اس کا کوئی نظیر ہے تو حکیم ابو الفتح ہے، جس کے رقعات چار باغ کے نام سے مشہور ہے،

فیضی کے خطوط سے اس زمانے کے تمدن، تہذیب معاشرت، آداب رسوم، ہر قسم کے حالات معلوم ہو سکتے ہیں، بعض بعض جگہ ہندی الفاظ بھی بول جاتا ہے، مثلاً والدہ کو "بوا جیو" کہا کرتا تھا، خط میں اُن کا ذکر آ گیا ہے تو یہی لفظ لکھ دیا ہے،

دیوان غزلیات کچھ اوپر نو ہزار شعر ہیں، خود دیباچہ لکھا ہے اور یہ تعداد بھی اس میں

لکھی ہے، دیباچہ میں یہ بھی عذر کیا ہے، کہ اس میں پست و بلند ہر قسم کا کلام ہے، خاتمہ میں چند رباعیاں لکھی ہیں، ایک یہ ہے،

این قصر سخن یافت عمارت از من — دریافت ز احباب اشارت از من
ہر نکتہ کہ مے ریخت ز نوکِ قلمم — معنے ز خدا بود عبارت از من

دیوان کا نام طباشیر الصبح رکھا، ایک خط سے جو ایک دوست کو لکھا ہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دیوان جب مرتب ہوا ہے، تو فیضی کی عمر ۴۰ سے کچھ اوپر تھی، اسی خط سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ غزل گوئی کا سلسلہ بند نہیں ہوا، بلکہ دوسرے دیوان کی طیاری کی ہے، قصائد، مختصر سا مجموعہ ہے، حمد، نعت، مدح، فخر، تصوف، اخلاق، وغیرہ مضامین پر الگ الگ قصیدے لکھے ہیں، قصیدوں کی تعداد کم ہے، قصائد کئی کئی سو شعر کے ہیں، طرحیں بھی اپنے معاصروں سے الگ اختیار کی ہیں، بیٹے کا ایک مرثیہ بھی ہے اور نہایت پُر درد ہے، خاتمہ میں قطعات بھی ہیں، لیکن یہ قطعات دیوان میں بھی شامل ہیں، بعض قصائد الحاقی معلوم ہوتے ہیں، مثلاً یہ قصیدہ،

وصیِ نبی آں کہ از صلب فطرت — بہ شاہِ اولوالعزم توام نشیند
امامے کہ روز وفاتِ پیمبر — خلافت گذارد بہ ماتم نشیند
گر فتم معاند دریں تنگ میدان — بر اشہب خر امد برادہم نشیند
کجا تربتِ کعبہ یابد سفیہے — کہ فردا بہ قعر جہنم نشیند
جہان پُر شد از فتنہ یا شاہِ مردان — تو برخیز کآشوب عالم نشیند

ابو الفضل کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ فیضی کے کل کلام کی تعداد ۵۰ ہزار کے لگ بھگ ہے،

تذکرہ، شعرا کا تذکرہ لکھنا شروع کیا تھا، لیکن اس کے سوا کہیں اُس کا پتہ نہیں چلتا، کہ ایک خط میں ایک دوست کو لکھتے ہیں،

کتاب مقاصد الشعرا را البتہ چوں تشریف آرند ہمراہ آرند کہ اختتام
تذکرہ موقوف بہ آں ماندہ، واز کتب دیگر ہم آنچہ توانند استنباط فرمودہ
فرمایند کہ فقیر مے خواہم، در خطبہ آں ذکر شریف کنم،

مہا بھارت ۹۰۹ سنہ ہجری میں اکبر نے حکم دیا کہ مہا بھارت کا ترجمہ کیا جائے، بڑے بڑے گُنوان پنڈت جمع ہوئے، اکبر خود عبارت کا مطلب نقیب خان کو سمجھا تا جاتا تھا، اور وہ فارسی میں ترجمہ کرتا تھا، پھر عبدالقادر بدایونی، ملا شیری وغیرہ کو الگ الگ ٹکڑے سپرد کئے، دو فن فیضی کے حصے میں آئے[1]،

اتھرون بید، اس کا ترجمہ بھی فیضی کی طرف منسوب ہے، لیکن عبدالقادر بدایونی کی تحریر سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ ۹۸۳ سنہ ہجری میں بھاون نام ایک برہمن جو دکن کا رہنے والا تھا، اسلام لایا، اور دربار میں حاضر ہوا، اکبر نے اس کو حکم دیا کہ اتھرون بید کا ترجمہ کرائے، اوّل اوّل یہ کام ملا عبدالقادر بدایونی کے سپرد ہوا، یعنی بھاون مطلب سمجھاتا جاتے اور یہ فارسی میں لکھتے جائیں، لیکن چونکہ اس کی عبارت نہایت پیچیدہ تھی، ملا صاحب نے عذر کیا، اکبر نے ملا صاحب کے بجائے فیضی اور پھر فیضی کے بجائے ابراہیم سرہندی کو ترجمہ کا حکم دیا، فارسی رامائن کو بھی عام لوگ فیضی کی طرف منسوب کرتے ہیں، لیکن یہ محض غلط ہے، رامائن کا ترجمہ اصل میں بدایونی نے ۹۹۹ سنہ ہجری میں چار برس کی محنت میں کیا تھا، پھر مسیحائے پانی پتی نے نظم میں لکھا، جو آج عام طور پر

[1] بدایونی واقعات سنہ ۹۹۰ ہجری،

مشہور ہے،

لیلاوتی، حساب میں ہے فیضی نے سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی،

فیضی کی شاعری، فیضی فطرۃً شاعر تھا، اس کا خاندان شاعری سے کچھ تعلق نہیں رکھتا تھا، تعلیم و تربیت بھی شاعری کی حیثیت سے نہیں ہوئی تھی، تاہم وہ بچپن ہی سے شعر کہتا تھا، لیکن چونکہ طبیعت مشکل پسند تھی اور عربیت کا زور تھا اس لئے طبیعت زیادہ تر صنائع کی طرف مائل تھی، اپنا بچپن کا کلام کوئی شاعر محفوظ نہیں رکھتا، فیضی نے بھی ضائع کر دیا ہوگا، لیکن ملا عبد القادر صاحب بدایونی کی بدولت ہم کو ایک غزل ہاتھ آئی ہے[1]

اے قدِ نیکوے تو سروِ رواں ۔۔۔ وے خمِ ابروے تو شکلِ کماں

حلقۂ گیسوے تو دامِ جنوں ۔۔۔ طرۂ ہندوے تو کامِ جناں

ہم لبِ جادوے تو آبِ حیات ۔۔۔ ہم خطِ دلجوے تو خضرِ زماں

پانچ شعروں کی غزل ہے اور صنعت یہ ہے کہ باوجود صنعت ترصیع کے ہر شعر چار بحروں میں پڑھا جاتا ہے،

ابتدا میں جو قصیدے ہیں اُن میں عربی نامانوس الفاظ کثرت سے ہیں، اور یہ وہی ملّایّت کا زور ہے مثلاً،

یکے معلیٰ شاہزادہ ہاے عظام ۔۔۔ کہ بر نہال فلک مے کنند اغصانی

کشمیر کا پورا قصیدہ دیکھو،

ایک قطعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابو الفرج رونی کا تتبع کرتا تھا،

[1] بدایونی جلد ۳، تذکرہ محوی شاعر،

فیضی منم آں کہ در معانی — گاہے بہ دو صد گنج گرفتم
تا کرد دلم عروج مستی — نہ چرخ درج درج گرفتم
ذوقے کہ تواں گرفت از شعر — از شعر ابو الفرج گرفتم

لیکن جس قدر اہل زبان سے اختلاط بڑھتا گیا زبان سادہ اور صاف ہوتی گئی، عرفی ظہوری، ملک قمی سے اکثر صحبتیں رہتی تھیں، خصوصاً عرفی کی زور طبع اور چاشنی سخن کا نہایت معترف ہے،

محتشم کاشانی کی تعریف میں لکھتا ہے،

حریر باف سخن محتشم کہ در کاشاں — بہ طرز تازہ طرز سخنوری دارد
یکے ز نکتہ وراں گفت دیدم اشعارش — عبارتے ست کہ معنی سرسری دارد
بگفتمش سخن او عبارتے ست ولے — عبارتے کہ بہ معنی برابری دارد

ان باتوں سے معلوم ہو سکتا ہے کہ اس کی شاعری پر کن چیزوں کا اثر پڑتا ہے،

فیضی نے قصیدہ، مثنوی، غزل سب کچھ کہا ہے، لیکن قصیدے بے مزہ ہیں ابتدائے کلام ایک طرف اخیر کے قصائد سے بھی ملائیت کی بو آتی ہے، البتہ مثنوی اور غزل لاجواب ہے، اور انہیں دونوں صنف پر ہم ریویو کرنا چاہتے ہیں،

فیضی کی خصوصیات میں سب سے بڑھ کر جوش بیان ہے، جس کا وہ موجد بھی ہے اور خاتم بھی، جوش بیان خواجہ حافظ میں بھی ہے اور اعلےٰ درجہ پر ہے، لیکن رندانہ مضامین اور دنیا کی بے ثباتی کے ساتھ مخصوص ہے، فیضی کے ہاں فخریہ، عشقیہ، فلسفیانہ ہر قسم کے مضامین میں وہی جوش پایا جاتا ہے، جوش بیان اس کے ذاتی حالات کا خاص اثر ہے جو کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکتا تھا، جوش بیان

غور کرو ایک شخص جس کے سینے میں تمام علوم وفنون کے خزانے بھرے ہوتے ہیں، فلسفہ اور حکمت کے نہایت دقیق نکتوں تک اس کی نظر پہنچتی ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ اور حریف معمولی سطح سے آگے نہیں بڑھ سکتے، آزاد خیالی اور بلند نظری اس کو آسمان تک پہنچاتے دیتی ہے، ان سب باتوں کے ساتھ قسمت کی یاوری نے اُس کو تخت شاہنشاہی کے برابر کھڑا کر دیا ہے ایسے شخص کے جوش مضامین کا کیا اندازہ ہو سکتا ہے، جب وہ تخت شاہی کے پاس کھڑے ہو کر اکبر کو مخاطب کرتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک سیہ مست جوش مستی میں آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، اور ہنکار رہا ہے،

شاہنشاہا! خرد پژوہا! — دریا گہرا! فلک شکوہا!
بزمے ست، جہان بہ عیش پیوست — دور تو شراب و آسمان مست
امروز بہ ایں نوائے چوں شہد — من بار بدم تو خسرو عہد
زیں خامہ کہ کردہ ام فلک سائے — پیش تو ستادہ ام بیک پائے
ایں نامہ کہ عشق بر زبان برد — طغرائے ترا بہ آسمان برد
ایں چار ہزار گوہرِ ناب — کانگیختہ ام بہ آتشین آب
بپذیر کہ آب گوہرِ تست — از بہر نثار افسرِ تست
پیمانۂ من اگر نشد پُر — دریا کنمت نثار نہ دُر
گر عشق چنیں بسوزدم پاک — مہتاب بردن برآرم از خاک
بگداختہ آبگینۂ دل — آئینہ وہم بدست محفل
آنم کہ بہ سحر کاری ژرف — از شعلہ تراش کردہ ام حرف
بانگِ قلمم دریں شبِ تار — بس معنیِ خفتہ کرد بیدار

هر صبح به فیض بادشاهی من بودم و باد صبح گاهی

اکبر نے جب نلدمن کی فرمایش کے لئے دربار میں بلایا ہے، اس حالت کو دیکھو کس جوش سے بیان کرتا ہے،

برخاستم از زمین فلک تاز برخاسته مو بمو به پرواز
چشمے که بره گذار کردم چشم دگرش نثار کردم
بگذشتم ازاں درِ ادب نیز کونین گذاشته به دهلیز
دیدم دو جهان بیک جهان در صد عمر ابد بیک زمان در
پیوند زمینیان گسستم، نزدیک به آسمان نشستم

یہی جوش فلسفیانہ اور عشقیہ مضامین میں بھی قائم ہے،

اے عشق ارخصت ست که از دوش آسمان بردوش خود نهم علم کبریائے تو
نظر فیض چو بر خاک نشینان فگنم مور را مغز سلیمان رسد از قسمتِ ما
از تفِ بادهٔ ما بال ملائک بگداخت وائے آں روز که برقے جهد از شیشهٔ ما
روئے کشاده باید و پیشانی فراخ آں جا که لطمه هائے ید الله مے زنند
ایں چه مے بود که ساقی بقدح ریخت فرد که مسیح و خضر از رشک کشاکش کردند
مپرس اهل نظر چوں بعرش پیوستند که پا بکنگرهٔ دل نهاده برجستند
عشق، صبر و خرد و هوش ز فیضی بربود دزدره بیں که بآں قافله سالار چه کرد
شدیم خاک ولیکن ببوئے تربتِ ما تواں شناخت کزیں خاک مردمی خیزد
عشق تا پائے بیفشرد در اندیشهٔ ما همه معشوق تراود زرگ و ریشهٔ ما
باده در جوش ست و یاران منتظر ساقیا! خُذْ مَا صَفَا دَعْ مَا کَدِرْ

مے کشد شعلہ سرے از دل صد پارۂ ما
جوش آتش بود امروز بفوارۂ ما

ہیچ دانی دل ما خورد چرا بشکستند
آسمان آئینہ ہا ساخت زسیارۂ ما

دریں دیار گروہے شکرلبان ہستند
کہ بادہ با نمک آمیختند و بد مستند

فیضی کفم تہی ورہ عاشقی بہ پیش
دیوان خود نگر بدو عالم گرو کنم

اقسام سخن میں فیضی فخریہ خوب کہتا ہے، اور اس عالم میں اس کا جوش بیان حد سے گذر جاتا ہے، ملاحظہ ہو،

امروز نہ شاعرم حکیم
دانندۂ حادث و قدیم

ہر موے زمن تمام گوش ست
خاموشی من بصد خروش ست

تا تازہ و تر زنم رقم را
در بادہ کشیدہ ام قلم را

ایں شیشہ نہادہ ام بران طاق
کاں جا نہ رسیدہ دست عشاق

اسراف معانیم نظر کن
زیں گنج بہ مفلسان خبر کن

مے ریخت زسحر کاری ژرف
از صبح ستارہ و زمن حرف

دروازۂ صبح بر رخم باز
کلکم ز شگاف پر تو انداز

ایں بادہ کہ جوشد از ایاغم
خونے ست چکیدہ از دماغم

صد دیدہ بورطۂ دل افتاد
کیں موج گہر بہ ساحل افتاد

دکانِ ہنر چنیں کشودن
سامان سخن چنیں نمودن

ایں کار من ست کار کس نیست
اندازۂ اختیار کس نیست

چوں بر سپہم نظر فگندند
در معرکہ ام سپر فگندند

برتافتم از دمِ سبک سیر	ناقوس برہمنان نہ دیر
بنگر کہ چسان بصد تنگ و تاز	برتار معانیم رسن باز
ہر نغمہ کہ بستہ ام برین تار	ناقوس نہفتہ ام بہ زنار
این گل کہ بہ بوستان نثاری است	از من بہ بہار یادگاری است

(۲) فیضی کی ممتاز خصوصیات شاعری میں سے استعارات کی شوخی اور تشبیہات کی ندرت ہے، اکبری دور کے شعرا میں یہ خصوصیت عام ہے، لیکن نوعی شیرازی اور عرفی اس وصف میں اپنے معاصرین سے ممتاز ہیں، اور فیضی ممتاز تر ہے، یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس خاص وصف میں فیضی پر عرفی کا اثر پڑا ہے، یا خود عرفی نے فیضی سے یہ شوخیاں سیکھی ہیں، ایک مستند ایرانی تذکرہ نویس نے فیضی کے حق میں یہ فیصلہ کیا ہے، لیکن چونکہ تذکرہ نویس صاحب فیضی کے معاصر ہیں، اور فیضی دربار کا ملک الشعراء تھا، اس لئے خوشامد کے سوءِ ظن کا موقع باقی رہتا ہے،

بہر حال استادی وشاگردی کی بحث نہیں، لیکن فیضی کی شوخی استعارات اور جدت تشبیہات سے انکار نہیں ہو سکتا، مثالیں ملاحظہ ہوں،

بزمے ست جہان بہ عیش پیوست	دورِ تو شراب و آسمان مست
زیں خامہ کہ کردہ ام فلک سائے	پیش تو ستادہ ام بیک پائے
گر عشق چنیں بسوز دم پاک	مہتاب بروں بر آرم از خاک
بگداختہ آبگینۂ دل	آئینہ دہم بدست محفل
بگداختہ ام دل و زبان را	کیں نقش نمودہ ام جہان را
امروز بدود مان ایام،	زد نوبت من سپہر بر بام

آنم کہ بہ سحر کاری ژرف، | از شعلہ تراش کردہ ام حرف
بانگ قلم دریں شبِ تار | بس معنی خفتہ کرد بیدار
برخاستم از زمین فلک تاز | برخاستہ مو بمو بہ پرواز

(۳) وہ اکثر فلسفیانہ مضامین باندھتا ہے، جس کے ساتھ ادّعا اور غرور کی جھلک بھی ہوتی ہے،

گویند ہمرہان طریقت کہ اے رفیق | آگاہ شو کہ قافلہ ناگاہ مے زنند
روے کشادہ باید و پیشانی فراخ | آں جا کہ لطمہ ہاے یداللہ مے زنند

اس شعر کا لفظی ترجمہ یہ ہے کہ جہاں خدا کے ہاتھ کے طمانچے پڑتے ہیں، وہاں شگفتہ روئی اور کشادہ جبینی درکار ہے، مطلب یہ ہے کہ صدمات قضا وقدر کی برداشت، یا تجلیات کی برق افگنی کے لئے نہایت صبر و استقلال درکار ہے،

عجب تراز دل فیضی ندیدہ ایم طلسم | کہ ہم گہر بود و ہم محیط و ہم غواص
چہ کششہاست کہ در زلف بتان تعبیہ شد | کز حقیقت دو جہان رو بہ مجاز آوردند
گر دلے گم شود از حلقۂ عشاق بپرس | ہر چہ بردند دریں قافلہ باز آوردند
عشق تا پاے بیفشرد در اندیشۂ ما | ہمہ معشوق تراود زرگ و ریشۂ ما
مسافران طریقت زمن جدا مشوید | کہ دور بینم و چشم بہ منزل افتادہ است
غافل نیم ز راہ ولے آہ چارہ چیست | زیں رہزنان کہ بر دل آگاہ مے زنند
اگر سرے نہ کشم سوے بیخودی چہ کنم | مراز ہمدمے خود ملال مے گیرد
بگریز کہ دوران فلک عربدہ خیز ست | آئینِ حریفان ہمہ کج دارو مریز ست

در دشت آرزو بنود بیم دام ودد　　راہے ست این کہ ہم زتو خیز دبلاے تو

خاک بیزان رہ فقر بہ جاے زوند

گوئی این طائفہ این جا گہرے یافتہ اند

فیضی کے دل میں فلسفیانہ خیالات کا جب زور ہوتا ہے اور اُن کے اظہار میں جب وہ مجبور ہوتا ہے تو اس مجبوری کو عجب انداز سے ظاہر کرتا ہے،

فلسفیانہ مسائل اس کے دل و دماغ میں بھر گئے ہیں چاہتا ہے کہ ظاہر کرے لیکن جانتا ہے کہ لب ہلے اور ظاہر بین علما قابو سے جاتے رہے، چونکہ علما ہی کے گروہ میں زندگی بسر کی ہے اور اپنے آپ کو اس دائرہ سے باہر نکالنا نہیں چاہتا اس لئے چاہتا ہے کہ اصل حقیقت بھی ظاہر کی جائے اور ہم فنون کا ساتھ بھی نہ چھوٹنے پائے، لیکن یہ کیونکر ہو سکتا ہے مجبوراً ساتھیوں سے انقطاع پر آمادہ ہوتا ہے، اور کہتا ہے،

آں نیست کہ من ہم نفسان را بگذارم　　با آبلہ پایان چہ کنم قافلہ تیز است

اسی مضمون کو ایک اور پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

فیضی از قافلۂ کعبہ روان نیست برون　　این قدر ہست کہ از ما قدرے در پیش ست

بعض وقت اس کو خیال آتا ہے کہ مسلمان بت پرستی کے سخت دشمن ہیں، لیکن کعبہ کی در و دیوار کی تعظیم میں ان کا جو طریق عمل ہے، اُس میں ظاہر پرستی کا صاف شائبہ پایا جاتا ہے اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے،

آں کہ میکرد مرا منع پرستیدن بت　　در حرم رفتہ طواف در و دیوار چہ کرد

پھر غور کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ نہیں کعبہ پرستوں کی یہ اخیر منزل نہیں مقصود اصلی وہی ذات بحت ہے لیکن بتدریج ان کو ابتدائی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے، اس بنا پر کہتا ہے،

کعبہ را ویران مکن اے عشق کانجا یک نفس　　گہ گہے پس ماندگان راہ منزل میکنند

(۴) غزل میں عام شعرا کا قاعدہ ہے کہ کوئی قدیم طرح سامنے رکھ لیتے ہیں، پھر ایک ایک قافیہ پر نگاہ ڈالتے ہیں اور جو قافیہ جس انداز سے بندھ سکتا ہے باندھتے جاتے ہیں رفتہ رفتہ غزل پوری ہو جاتی ہے، یہ بہت کم ہوتا ہے کہ پہلے کوئی مسلسل یا مفرد خیال دل میں آئے اس کو شعر میں ادا کریں، پھر غزل پوری کرنے کے لئے اور اشعار بھی لکھتے جائیں، لیکن فیضی کی اکثر غزلوں میں صاف نظر آتا ہے کہ کسی واقعہ کے اثر سے کوئی خیال دل میں آتا ہے اور اسی کو وہ ادا کر دیتا ہے، خطوط میں جا بجا لکھتا ہے کہ فلاں واقعہ نے یہ خیال پیدا کیا، اور وہ غزل کی صورت میں ادا ہوا، مثلاً دکن کے سفر میں ایک دفعہ کچھ ہنگامہ ہوا، لوگ شہر چھوڑ چھوڑ کر بھاگنے لگے فیضی نے بہت روکا، کسی نے نہ سُنا اُس وقت بے اختیار اُس کی زبان سے یہ غزل ادا ہوئی،

بازیاران طریقت سفرے درپیش است　　رہ نوردان بلا را خطرے درپیش است

کس نمے گویدم از منزل اول خبرے　　صد بیابان بگذشت و دگرے درپیش است

ہمرہان این ہمہ نومید نباشید از من　　کہ دعاے سحرم را اثرے درپیش است

ما نہ آنیم کہ نادیدہ قدم بگذاریم　　شکر کن قافلہ را راہبرے درپیش است

اے صبا! بر سر آفاق گُل مژدہ بریز　　کہ شب تیرۂ ما را سحرے درپیش است

فیضی از قافلۂ کعبہ روان بیرون نیست　　این قدر ہست کہ از ما قدرے درپیش است

اسی طرح اکبر جب گجرات کی مہم سے آیا ہے، تو ایک غزل لکھی ہے، جس کا مطلع یہ ہے،

نسیم خوش دلی از فتحپور مے آید　　کہ بادشاہ من از راہ دور مے آید

احمد آباد گجرات میں پہنچا ہے تو وہاں کے دلفریب حسن نے اس پر ایک خاص اثر کیا
ہے وہی غزل میں ادا کرتا ہے،

منم کہ کشتۂ گجراتیاں بیدادم | خراب عشوۂ خوبان احمدآبادم
سہی قدے ز سر ناز جلوۂ ننمود | کہ ہمچو سایہ بدنبال آں نیفتادم
بہر طرف کہ خرامید سرو آزادی | غلام او شدم و خط بندگی دادم
چو رشک گلشن فردوس احمدآباد است | از و مباد برونم کشند چوں آدم
بہ حسن مردم گجرات بادنیست شلے | نمے روند جوانان دہلی از یادم

لیکن انصاف یہ ہے کہ ایک حکیم، ایک فلسفی، ایک ادیب، عشق کی کڑیاں نہیں
جھیل سکتا،

بہ سوز عشق، شاہان را چہ کار است | کہ سنگ لعل، خالی از شرار است

اس بنا پر فیضی کے عشقیہ اشعار میں وہ سوز و گداز نہیں، جو عاشق تن شعرا کا خاصہ
ہے نظیری فتنہ گراں گجرات کی شان میں کچھ کہتا، تو تم دیکھتے کہ سننے والے دل تھام کر رہ جاتے،
بہر حال فیضی کے تغزل کا اندازہ کرنا چاہو تو اشعار ذیل سے کر سکتے ہو،

آنچہ بہ فیضی نظر دوست کرد | مشکل اگر دشمن جانی کند
ناشکرئے عشق چوں توان کرد | غم بر سر غم فزود مارا
حیران فسوں سازی عشقم کہ خیالت | از دیدہ درون آید و در سینہ نگنجد

شب وصل کے ذکر میں ایک غزل لکھی ہے، دو شعر سننے کے قابل ہیں،

نہ گویم اے فلک از کج رویہا بیت تو برگردی | شب وصل است خواہم اندکے آہستہ تر گردی
ز مہتاب رخش کاشانۂ من روشن است امشب | اگر وقت طلوعت آید اے خورشید برگردی

عرفی شیرازی

عرفی کا نام ونسب | محمد نام، جمال الدین لقب، عرفی تخلص، باپ کا نام زین الدین ملوی، اور دادے کا جمال الدین چادر باف تھا، ایران میں اُن محکمہ جات اور عدالتوں کو جو مذہبی صیغہ سے تعلق نہیں رکھتیں، "عرف" کہتے ہیں، عرفی کا باپ شیراز کی دارالحکومت میں ایک معزز عہدہ پر ممتاز تھا، عرفی نے اسی مناسبت سے اپنا تخلص عرفی رکھا تھا آثر رحیمی میں ہے،

چوں پدرش بعض اوقات در دیوانِ حُکّامِ فارس بہ امرِ وزارت دارو غہ دارالافاضل شیراز مشغولی مے نمود مناسبت شرعی عرفی رامنظور داشتہ تخلص خود عرفی کرد،

اس تخلص کے اختیار کرنے کے متعلق اس قدر اور کہنا ضرور ہے کہ عرفی فطرۃً مغرور اور خود ستا تھا، چونکہ ایران کے اکثر شعرا معمولی خاندانوں سے تھے، مثلاً خاقانی بڑھئی تھا، فردوسی باغبانی کرتا تھا، باقر کاشانی خردہ فروش تھا، برخلاف اس کے عرفی ایک معزز

سلہ عرفی کے حالات اگرچہ مختصراً عام تذکروں میں ملتے ہیں، لیکن مستند اور دلچسپ واقعات آثر رحیمی اور تذکرہ عرفات اوحدی کے سوا اور کسی تذکرہ میں نہیں پائے جاتے، مآثر رحیمی، اصل میں عبدالرحیم خانخاناں کی سوانحمری ہے، لیکن اس میں تمام ان شعرا اور اہل فن کا تذکرہ ہے، جو خانخاناں کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، اس کتاب مصنف خود ان شعرا کا ہمعصر تھا، اس لئے دلچسپ حالات بہم پہنچائے ہیں، اور اکثر واقعات چشم دید لکھے ہیں، عرفات کا مصنف بھی قریب قریب اسی زمانہ میں تھا، اور اس نے عرفی کو تیس برس کی عمر میں دیکھا تھا، یہ دونوں کتابیں میرے پیش نظر ہیں،

خاندان کا آدمی تھا، اور اس کا باپ سرکاری محکمہ سے بھی تعلق رکھتا تھا اس لئے تخلص میں بھی فخر کی ادا قائم رکھی، عرفی نے نام و نسب پر اکثر فخر کیا ہے اور یہ بھی اُس کے خصوصیات میں ہے۔ ورنہ ایران کے شعرا میں نسب کا فخر بہت ہی شاذ و نادر پایا جاتا ہے،

عرفی کی تعلیم و تربیت شیراز میں ہوئی، شاہ نواز خاں (مصنف مآثر الامرا) نے تذکرۂ بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ عرفی نے علاوہ معمولی علوم کے مصوری و نقاشی کی بھی تعلیم پائی تھی۔ عرفی نے جب ہوش سنبھالا تو سلطنت صفویہ کا شباب تھا، اور طہماسپ و عباس کی علم پروری نے تمام ایران کو علم و ہنر کی نمائش گاہ بنا دیا تھا، بالخصوص شاعری بڑے زوروں پر تھی، محتشم کاشی، وحشی یزدی، غیرتی وغیرہ نے فغانی کی طرز کو اور زیادہ شوخ کر دیا تھا اور تمام ملک اُن کی زمزمہ سنجیوں سے گونج اُٹھا تھا، عرفی نے بھی اپنے اظہار کمال کے لئے یہی میدان پسند کیا، اور باوجود کم سنی کے بڑے بڑے پُرانے استادوں کے ساتھ معرکہ آرائی شروع کر دی، اس زمانے میں فغانی کی اکثر غزلیں طرح کی جاتی تھیں اور محتشم کاشی وغیرہ ان میں غزلیں لکھتے تھے، عرفی بھی انہیں طرحوں پر غزلیں لکھتا تھا اور عام مشاعروں میں بے باکانہ پڑھتا تھا، وحشی یزدی یزد میں سکونت رکھتا تھا، اس لئے اس سے تحریری مناظرات رہتے تھے، اوحدی نے لکھا ہے کہ جب میں شیراز گیا تو مشہور شعراء کے نام دریافت کئے، لوگوں نے غیرتی کا پتہ دیا، شیراز میں ایک دُکان تھی جو شعرا کا دنگل تھا، یہاں عارف لاہجی، حسین کاشی مورخ، میر ابو تراب، تقیای شبستری مخاطب بہ مورخ خان، رضای کاشی وغیرہ مشاعرے کرتے تھے، مشاعرہ میں غیرتی اور عرفی سے مباحثہ ہوا، عرفی نے دعوے کے دونوں پہلو مخالف اور موافق لئے اور دونوں میں غیرتی پر غالب آیا،

عرفی کی قدر دانی کے لئے اگرچہ ایران میں بھی کچھ کم سامان نہ تھا، تاہم ہندوستان کی سی بات کہاں نصیب ہو سکتی تھی، جس کی بدولت ایران کے ہر ہر گوشے سے اہل فن کھنچے چلے آتے تھے،

بعض تذکروں میں لکھا ہے کہ عرفی شہزادہ سلیم کے حسن پر غائبانہ عاشق ہو کر آیا، بہرحال اس نے ہندوستان کا رخ کیا، راستہ میں ڈاکہ پڑا اور اس کی کل کائنات جاتی رہی، اس پر یہ رباعی لکھی،

دوشینہ کہ بُرد برد بردوشم بود　　زانو چو عروسِ نو در آغوشم بود
پوشید نئے نداشتم غیر از چشم　　چیزے کہ بزیر سر نہم گوشم بود

ہندوستان میں اگرچہ سینکڑوں امراء اور اہل دول تھے، لیکن عرفی نے ان سب میں فیضی کو انتخاب کیا جس کی وجہ یا تو یہ تھی کہ اس کے دربار تک پہنچنا آسان تھا، یا یہ کہ سخن شناسی کی توقع جو فیضی سے ہو سکتی تھی اور کسی سے نہیں ہو سکتی تھی عرفی فتحپور سیکری میں فیضی سے ملا، فیضی نے اس کی پوری قدر دانی کی، پنجاب کے سفر میں وہ اٹک تک فیضی کے ہمرکاب رہا اور اس کی تمام ضروریات فیضی ہی کی سرکار سے انجام پاتی رہیں[1]، لیکن عرفی کی نخوت پرستی کی وجہ سے صحبت بر آر نہ ہو سکی اور بالآخر اس دربار سے قطع تعلق کرنا پڑا،

اس زمانہ میں اکبری دربار کے نورتن سب موجود تھے، ان میں حکیم ابوالفتح گیلانی اگرچہ ظاہری منصب و اقتدار کے لحاظ سے سب سے کم پایہ تھا، یعنے صرف ہزاری منصب رکھتا تھا، لیکن بہت بڑا عالم اور علم و فضل کا بڑا قدردان تھا، اس کے ساتھ عرفی کا ہم وطن اور

[1] تاریخ بدایونی،

ہم مذہب تھا، ان خصوصیات کی بنا پر اس نے اسی کو ترجیح دی، اور قصیدہ مدحیہ لکھ کر پیش کیا یہ پہلا دن تھا کہ عرفی کے غرور کی آن ٹوٹی، غالباً خود عرفی کو بھی اس کا سخت صدمہ ہوا، چنانچہ قصیدہ میں اس کے اشارے پائے جاتے ہیں،

چونکہ حکیم ابوالفتح بڑا نکتہ شناس اور نقاد فن تھا، عرفی نے اس کے فیض صحبت سے بہت ترقی کی، حکیم ابوالفتح نے ایک رقعہ میں جو خانخاناں کے نام ہے یہ الفاظ لکھے ہیں،

ملا عرفی و ملا حیاتی بسیار ترقی کردہ اند"

اللہ اکبر! ایک وہ زمانہ تھا کہ امراء اور اہل دول علم و فضل میں یہ پایہ رکھتے تھے کہ عرفی جیسے اہل کمال اُن کی صحبت سے مستفید ہو سکتے تھے، عرفی نے بھی حکیم ابوالفتح کی احسانمندی کا پورا حق ادا کیا، جس زور کے قصیدے حکیم صاحب کی شان میں لکھے اکبر و خانخاناں کی مدح میں بھی نہیں لکھے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جب تک ابوالفتح زندہ رہا، اس نے خود اپنی خواہش سے کسی دربار کی طرف رُخ نہیں کیا،

حکیم ابوالفتح اور خانخاناں سے نہایت درجہ کا اتحاد تھا، حکیم موصوف کی فرمایش سے عرفی نے خانخاناں کی مدح میں قصیدہ لکھا، جسکا مطلع یہ ہے ع، بیا کہ بادلم آں مے کند پریشانی اس قصیدہ میں اس واقعہ کا نہایت لطیف پیرایہ میں ذکر کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے

ازاں نہ دیدہ ثنا گو میت کہ مے بینم | ترا، و او را یکتن بچشم روحانی

دلیل وحدتم ایں بسکہ مدح خود میخواست | مرا بمدح تو فرمود گوہر افشانی

حکیم ابوالفتح نے ۹۹۷ھ ہجری میں انتقال کیا، عرفی پر اس واقعہ کا سخت اثر ہوا، چنانچہ اس زمانہ میں خانخاناں کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے، اُس میں کہتا ہے،

لے خزانہ عامرہ ذکر حیاتی گیلانی،

چہ احتیاج کہ گویم کہ مُردہ عرفی را — چہ بر سر از ہوسِ مرگ ناگہاں آمد
برفتنت لطف تو بر من گذاشت این بیداد — بہ نزدِ عقل کہ تاوان آں زیاں آمد
تو آگہی کہ مرا از غروب ایں خورشید — چہ گنجہائے سعادت زیاں جاں آمد

حکیم ابو الفتح کے مرنے کے بعد عرفی خانخاناں کے درباریوں میں داخل ہوا، اور پھر خاندان شاہی کے سوا، اور کسی کے آستانہ پر کبھی سر نہیں جھکایا، چنانچہ خود فخریہ کہتا ہے،

یک منعم و یک نعمت و یک منت و یک شکر — صد شکر کہ تقدیر چنیں راندہ قلم را

خانخانان امرائے اکبری کا گل سر سبد تھا، اس زمانے میں وہی ایک شخص تھا جس کے تاج فخر پر صاحب السیف والقلم کا طرّہ زیب دیتا تھا، گجرات کی فتح جس میں اس نے دس ہزار فوج سے چالیس ہزار کی جمعیت کو شکست دی، اس کی شجاعت کا ایک معمولی کارنامہ ہے خود شاعر اور شعرا کا بڑا قدردان تھا، عبد الباقی نہاوندی نے اس کے مفصل حالات دو جلدوں میں لکھے ہیں، ایک جلد میں صرف اس کے دربار کے شعرا اور اہل کمال کا تذکرہ ہے،

عرفی نے خانخاناں کے دربار میں پہنچکر خاطر خواہ ترقی حاصل کی، مآثر رحیمی میں لکھا ہے،

بہ اندک فرصتے بہ یُمن تربیت و شاگردی و مداحی ایں دانای رموز،
پختگی تمام و ترقی الا کلام در منظوماتش بہم رسید،

چونکہ خانخانان کے دربار میں بڑے بڑے نامور شعرا مثلاً نظیری نیشاپوری، شکیبی اصفہانی انیسی، ظہوری وغیرہ سے مقابلہ رہتا تھا، عرفی کا کلام روز بروز ترقی کرتا جاتا تھا، یہاں تک کہ تقرب اور اختصاص میں بھی وہ حریفوں کی صف کو چیرتا ہوا آگے نکل گیا، یہ

بات اسی کو نصیب ہوئی کہ دربار میں جاتا تھا تو عام طریقہ پر آداب و کورنش نہیں بجالاتا تھا، اور جس جگہ جس طرح چاہتا تھا بیٹھ جاتا تھا، مآثر رحیمی میں ہے،

در ایام ملازمت تسلیم و کورنشے کہ در ہندوستان متعارف ست کہ بعوض سلام بصاحبان مے کنند بہ صاحب خود نمے کرد، و بہر طرز و طور در روشے کہ میخواست در مجالس مے نشست، و اہل عالم تقدیم او را قبول مے نمودند،

خانخاناں نے عرفی کے ساتھ وقتاً فوقتاً جو فیاضیاں کیں، اس کی ایک ادنےٰ مثال یہ ہے کہ ایک قصیدے پر ستر ہزار روپے انعام دلوائے[1]،

عرفی نے اگرچہ خانخاناں کے سوا امراء اور اہل دربار میں سے کسی کی مدح سرائی گوارا نہ کی، لیکن فرمانروائے وقت سے یہ بے نیازی ممکن نہ تھی، اس لئے خود اپنی خواہش یا خانخانان کی فرمایش سے اکبر کی مدح میں اس نے متعدد قصاید لکھے، لیکن ابو الفضل اور فیضی کے آگے اس کا چراغ نہیں جل سکتا تھا، ابو الفضل نے اکبر نامہ اور آئین اکبری دونوں میں اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن اس طرح کہ نہ کرتا تو اچھا تھا، اکبر نامہ میں لکھتا ہے،

ورے از سخن سرائے بر دکشودہ بود ندر خود نگریست و بر پاستانیاں زبان طعن کشود، غنچہ استعداد نشگفتہ پژمرد،

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ عرفی حد سے زیادہ مغرور اور خود ستا تھا، اور اساتذہ سلف کا نام اپنے مقابلہ میں تحقیر سے لیتا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

انصاف بدہ بوالفرج و انوری امروز | بہر چہ غنیمت نشمارند عدم را
بسم اللہ ز اعجاز نفس جان شان دہ باز | تا من قلم اندازم و گیرند قلم را

---

[1] خزانہ عامرہ تذکرۂ عرفی،

تفرجے کہ من از بہر روح سازدہم | نہ انوری نہ فلانی و ہد نہ بہمانی
نازش سعدی بہ مشت خاک شیراز ارچہ بود | گر نمے دانست باشد مولد و ماوائے من
دم عیسئے تمنا داشت خاقانی کہ برخیزد | بہ امداد صبا اینک فرستادم بشیروانش

اس کے فخر و غرور سے تمام ہمعصر نالاں تھے، یہاں تک کہ نظیری نیشاپوری جو ایک مرنج مرنجان شاعر تھا، اس سے بھی ضبط نہ ہو سکا، چنانچہ ایک قصیدہ میں جو عرفی کے مرنے کے بعد اس کے جواب میں لکھا ہے کہتا ہے،

دریں قصیدہ بہ گستاخی ارچہ عرفی گفت | بداغ رشک پس از مرگ سوخت خاقانی
کنوں بگور چنان او برشک مے سوزد | کہ در تنور، توان گوسفند بریانی

قصیدہ کشمیریہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے ۹۹۷؁ ہجری میں کشمیر کا جو سفر کیا تھا اُس میں عرفی بھی ہمرکاب تھا، ایک قطعہ سے ثابت ہوتا ہے کہ اکبر نے کسی موقع پر ایک گھوڑا بھی انعام میں دیا تھا، لیکن عرفی نے بجائے اس کے کہ شکر کا اظہار کرتا، اُلٹے گھوڑے کی ہجو لکھی،

شاہنشہا حقیقت اسپی کہ دادۂ | بشنو ز لطف تا برسانم بعز عرض
ہستم براو سوار و بمعنی پیادہ ام | گامے بطول مے زدم اکنوں زدم بعرض

خانخانان اور اکبر کے سوا عرفی نے کسی اور آستانہ کی ناصیہ سائی کی تو وہ شاہزادہ سلیم تھا، اور عرفی کی تاریخ زندگی میں یہ واقعہ ایک خاص حثییت رکھتا ہے، تمام تذکرے متفق ہیں کہ عرفی شہزادۂ مذکور کا جان دادہ تھا، یہ امر اگرچہ بظاہر بالکل خلاف قیاس ہے لیکن عرفی کے قصائد میں بلاشبہ یہ جھلک پائی جاتی ہے، شاہزادۂ موصوف کی شان میں اس کے جو قصیدے ہیں ان کے دیکھنے سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ اور کوئی جوش ہے جس کا

رنگ مداحی کے لباس میں بھی جھلک رہا ہے عرفی کو اس خوش قسمتی پر ناز ہو سکتا ہے کہ شہزادہ نے خود اُس کو یاد کیا اور دربار میں بلاکر قصیدہ لکھنے کی فرمایش کی عرفی جس شان سے دربار میں پہنچا ہے اور شہزادہ نے جس طرح اُس سے نگاہ پنہان کی زبان سے باتیں کی ہیں، اس کی تصویر خود عرفی نے نہایت خوبی سے کھینچی ہے

که ناگهان ز درم دررسید مژده دہے — چناں که از چمن طالعم بمغز شمیم

چه گفت، گفت که "ای مخزن جواہر قدس" — چه گفت، گفت که "اے مطلب بهشت نعیم"

بیا که از گہرت یاد مے کند دریا — بیا که تشنه لبت را طلب کند تسنیم

بره فتادم و گشتم چناں شتاب زده — که دست اہل کرم در نثار گوہر و سیم

مرا چو دوش بدوش ادب بدید استاد — بلطف خاص بدل کرد التفات عمیم

رموز کورنش و تسلیم را ادا کردم — به داب مردم دانا و بذله سنج ندیم

نگفت و من بشنودم ہر انچه گفتن داشت — که در بیان نگهش کرد بر زبان تقدیم

لبش چو نوبت خویش از نگاه باز گرفت — فتاد سامعه در موج کوثر و تسنیم

اخیر کے دونوں شعروں کا مطلب یہ ہے،

شہزادہ نے کچھ نہیں کہا اور میں نے سُن لیا، کیونکہ تقریر کرنے میں اس کی نگاہ نے زبان پر پیش دستی کی، پھر جب نگاہ سے گزر کر ہونٹوں کی باری آئی تو میرے کان کوثر و تسنیم کی موجوں میں ڈوب گئے،

شیخ سعدی نے ایک قطعہ میں یہ مضمون باندھا تھا، کہ اُس شاعر کو عاشقی کا نام نہ لینا چاہئے جو قصیدہ میں دو چار شعر عشقیہ کہہ کر مداحی شروع کر دیتا ہے، عرفی نے اس پر ایک قطعہ لکھا ہے اس میں شہزادہ سلیم کی معشوقی کی طرف نہایت لطیف اشارہ کیا ہے،

وی کسے گفت کہ سعدی گہر افروز سخن | قطعۂ گفت کہ اندیشہ براں مے نازد
سخن عشق حرام ست براں بیہدہ گوے | کہ چودہ بیت غزل گفت، مدیح آغازد
گفتم ایں خود ہمہ عیب ست کہ در راہِ تمیز | ہر کہ ایں لاف زند رخشِ دوئی مے تازد
لوحش اللہ زیک اندیشی عرفی کورا | آنکہ ممدوح بود عشق بہ او مے بازد

یعنی سعدی گو ممدوح کو معشوق پر ترجیح نہیں دیتے لیکن بہر حال معشوق کے علاوہ اُن کا کوئی ممدوح بھی ہے، لیکن میرا تو ممدوح بھی وہی ہے جو معشوق ہے،

وفات تذکرۂ داغستانی وغیرہ میں لکھا ہے کہ حاسدوں نے اس کو زہر دے دیا، بعضوں نے لکھا ہے کہ زہر دینے کی وجہ شہزادہ سلیم کے ساتھ عشق کا اظہار تھا، ابوالفضل نے اکبر نامہ ۹۹۹ سنہ ہجری کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے،

سیزدہم [۱۳]، عرفی شیرازی رخت ہستی بربست، درے از سخن سرائے بروے کشودہ بودند، اگر در خود نہ نگرستے زندگی را بشائستگی اسپردے وزمانہ لختے فرصت دادے، کار او بلند، دریں نزدیکی ایں رباعی برسنجیدہ بود،

عرفی دم نزع است وہمانِ مستی تو | آیا بچہ مایہ رخت بربستی تو
فرداست کہ دوست، نقد فردوس بکف | جویاے متاع ست وتہیدستی تو

انتقال کے وقت اس کی عمر ۳۶ برس کی تھی،

تذکرۂ داغستانی میں لکھا ہے کہ لاہور میں مدفون ہوا، اور چند روز کے بعد کوئی درویش کسی اور بزرگ کے دھوکے میں اُس کی ہڈیاں قبر سے نکال کر نجف میں لے گیا، اور وہاں دفن کر دیں، لیکن یہ غلط ہے عبدالباقی نے جو خود عرفی کا معاصر تھا مآثر رحیمی میں لکھا ہے کہ میر صابر اصفہانی نے جو اعتماد الدولہ غیاث بیگ (وزیر اور خُسر جہانگیر بادشاہ) کا درباری تھا

ایک قلندر کو رقم کثیر دی کہ عرفی کی ہڈیاں لاہور سے نجف لے جائے، بہرحال عرفی کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی،

اگر بہند ہلاکم کنی وگر بہ تتار | بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم

ملا رونقی ہمدانی نے اس واقعہ کی تاریخ میں یہ قطعہ لکھا،

یگانہ گوہر دریائے معرفت عرفی | کہ آسمان پئے پرورشش صدف آمد

بکاوش مژہ از گور تا نجف بروم | زدہ است تیر دعائے وبر ہدف آمد

رقم زداز پئے تاریخ رونقی کلکم | بکاوش مژہ از گور تا نجف آمد

اخلاق وعادات

عرفی کے اخلاق وعادات میں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں ہے وہ فخر، غرور، کم بینی، خودستائی ہے، اس کے معتقدین خاص تک اس کے غرور سے نالاں ہیں، بدایونی نے فیضی کے توڑ پر اس کو بہت چمکایا ہے تاہم یہ لکھنا پڑا،

اما ازبس عجب ونخوت کہ پیدا کرد از دلہا افتاد،

معلوم ہوتا ہے کہ اس رعونت نے تمام لوگوں کو اس کا دشمن بنادیا تھا، ایک دفعہ بیمار ہوا اور شاید یہ وہی مرض الموت کی بیماری تھی، لوگ عیادت کو آئے لیکن چونکہ دل صاف نہ تھے غمخواری کے لہجہ میں جو بات کہتے تھے اُس میں دل آزاری کا پہلو ہوتا تھا، عرفی بھی سمجھتا تھا اور دل ہی دل میں پیچ وتاب کھاتا تھا، اسی حالت میں ایک قطعہ کہا جس میں مرض کی شدت بیان کرکے لوگوں کی ستم ظریفانہ بیمار پرسی کی تصویر کھینچی ہے، عرفی عالم تخیل کی بلندی سے نیچے نہیں آتا لیکن اس قطعہ میں واقعہ نگاری اختیار کی ہے اور سماں باندھ دیا ہے،

تن افتادہ دریں حال ودوستان فصیح | بہ دورِ بالش وبستر ستادہ چوں منبر

یکے بہ ریش کشد دست وکج کند گردن | کہ روزگار وفا با کہ کرد؟ جان پدر

بر جاہ و مال فرومایہ، دل نباید بست   کجا است دولت جمشید و نام اسکندر

یکے بر زمی آواز و گفت و گوے حزیں   کند شروع و کشد آستین بدیدۂ تر

کہ جان من! ہمہ را ایں رہ است و باید رفت   تمام راہ روانیم و دہر راکب بر

یکے بہ چرب زبانی سخن طراز شود   کہ اے وفات تو تاریخ انقلاب خبر

فراہم آے و پریشان مدار دل زنہار   کہ نظم و نثر تو من جمع مے کنم یکسر

پس از نوشتن و تصحیح مے کنم انشا   بہ مدعاے تو دیباچہ چو درج گہر

چنانچہ ہستی فہرست دانش و فرہنگ   چنانچہ ہستی مجموعۂ صفات و ہنر

بہ نظم و نثر در آویزم و فرو ریزم   اگرچہ حصر کمال تو نیست حد بشر

ان سب کے جواب میں عرفی جل کر کہتا ہے،

خداے عز و جل صحتم دہد، بینی   کہ ایں منافقگان راچہ آورم برسر

نہایت حاضر جواب اور ظریف الطبع تھا، ایک دفعہ ابوالفضل کے گھر پر اُس سے ملنے گیا دیکھا تو ابوالفضل قلم دانتوں میں دابے ہوئے سونچ میں بیٹھا ہے، سبب پوچھا، ابوالفضل نے کہا بھائی صاحب کی تفسیر بے نقط کا دیباچہ اُسی صنعت میں لکھ رہا ہوں، ایک موقع پر والد کا نام آگیا ہے چاہتا ہوں کہ نام بھی آئے اور صنعت کا التزام بھی ہاتھ سے نہ جائے، عرفی نے کہا تردد کی کیا بات ہے، اپنے لہجہ میں ممارک لکھدیجئے (مبارک نام تھا، جس کو گنوار ممارک کہتے ہیں)

ایک دفعہ فیضی بیمار تھا، عرفی عیادت کو گیا، فیضی کو کتوں سے بہت شوق تھا، چند سگ بچے گلے میں سونے کے پٹے ڈالے پھر رہے تھے، عرفی نے کہا،

مخدوم زادہا بہ چہ اسم موسوم اند،

فیضی نے کہا یہ اسم عرفی، یعنی معمولی نام ہیں،

عرفی نے کہا مبارک باشد[1]

ظہوری سے اکثر دوستانہ خط کتابت رہتی تھی، ایک دفعہ ظہوری نے کشمیر کی شال تحفہ میں بھیجی، غالباً شال معمولی درجہ کی تھی، عرفی نے جواب میں رقعہ لکھا جس میں تین رباعیاں شال کی ہجو میں تھیں، ایک[2] یہ ہے،

ایں شال کہ وصفش نہ حد تقریرست ——— آیات رعونت مرا تفسیرست

نامش نہ کنی تماش کشمیر کرد ——— صد رخنہ بکار مردم کشمیر ست

عرفی کی بداخلاقی کے سب شاکی ہیں، لیکن تعجب ہے کہ فیضی نے جو اس کا سب سے بڑا حریف کہا جاتا ہے، عرفی کی شریف النفسی کی نہایت تعریف کی ہے، چنانچہ اپنے رقعہ میں جس کی پوری عبادت آگے چل کر آئے گی لکھتا ہے،

واز تہذیب اخلاق چگوید کہ در خاکی نہاد شیراز ذاتی مے باشد نہ کسبی،

شاید یہ ابتدائی ملاقات کا حال ہوگا جب فیضی کو پورا تجربہ نہیں ہوا تھا،

معلوم ہوتا ہے کہ عرفی بخلاف اور شعرا کے رند اور اوباش نہ تھا، کسی نے اس کو فسق کا الزام دیا تھا، اس پر اس کو سخت صدمہ ہوا، ایک قطعہ میں اس کا اظہار کیا ہے اور خاتمہ میں اپنے دل کو اس طرح تسلی دی ہے،

اہل دنیا ہمگی تہمت گیر ند و فساد ——— عیسےٰ ایں را متحمل شد و مریم برداشت

باوجود بدمزاجی اور غرور کے عرفی نے کسی کی ہجو سے زبان آلودہ نہیں کی، یا کسی کو

---

[1] یہ دونوں واقعات خافی خاں نے حالات اکبر واقعات سنہ ۱۰۰۰ ہجری میں لکھے ہیں (خافی خاں صفحہ ۲۰۰) دوسرا واقعہ بدایونی میں بھی مذکور ہے، [2] خزانہ عامرہ ذکر ظہوری)

اس قابل نہیں سمجھتا ہوگا، ایک قصیدہ میں بہت جل کر کہا ہے تو صرف اس حد تک اکتفا کیا ہے

بامن از جہل معارض شدہ نا منفعلے

تصنیفات | نفسیہ، تصوف میں ہے، نام سے معلوم ہوتا ہے کہ نفس کے متعلق کوئی رسالہ ہو، آثر رحیمی میں اس کی نسبت لکھا ہے

ورسالہ نیز موسوم بہ نفسیہ در نثر نوشتہ کہ صوفیان و درویشان را سرلوحۂ دفتر تصوف و تحقیق سمے تواند شد،

مثنوی، بجواب مخزن اسرار، دیوان کے ساتھ چھپی ہے،

مثنوی، بجواب شیریں خسرو، آتشکدہ اور مجمع الفصحا میں اس کے اشعار نقل کیے ہیں،

کلیات قصائد و غزلیات سنہ ۹۹۶ ہجری میں ایک دیوان ترتیب دیا تھا جس میں ۲۶ قصیدے، ۲۷۰ غزلیں اور ۷۰۰ شعر کے قطعات اور رباعیاں تھیں، اس دیوان کی خود ہی تاریخ کہی تھی،

ایں طرفہ نکات سحری و اعجازی | چوں گشت مکمل بہ رقم پردازی

مجموعہ طراز قدس، تاریخش یافت | اول دیوان عرفی شیرازی

اس رباعی میں عجیب و غریب صنعت رکھی ہے، چوتھا مصرع جس سے تاریخ نکلتی ہے اس میں اکائیوں کے عدد لئے جائیں، تو قصائد کی تعداد کے موافق ہوتے ہیں یعنی ۲۶ و ہائیوں کے عدد حساب کئے جائیں تو غزلوں کی تعداد کے برابر ہوتے ہیں یعنی ۲۷۰- اور سینکڑوں کو لیا جائے تو قطعات اور رباعیوں کی تعداد ظاہر ہوتی ہے یعنی ۷۰۰، مختصر یہ کہ اسی مصرع میں تاریخ بھی ہے اور ہر قسم کے اشعار کی الگ الگ تعداد بھی،

یہ اخیر کا کلام ہے، اس سے پہلے چھ ہزار شعر کہے تھے، وہ بدقسمتی سے ضائع ہو گئے،

چنانچہ اُس کے ماتم میں ایک پُر درد غزل[1] لکھی جو دیوان میں موجود اور ذیل میں درج ہے،

عمر در شعر بسر کردہ و در باختہ ام ۔۔۔ عمر در باختہ را بار دگر باختہ ام
ساقیِ مصطبۂ لطفم و مے ریختہ ام ۔۔۔ طائرِ باغچۂ قدسم و پر باختہ ام
اُلعطش مے زند از تشنہ لبی ہر مویم ۔۔۔ کہ قدح ہائے پُر از خونِ جگر باختہ ام
رَصَدِ شرعِ ہنر چوں نہ شود محو کہ من ۔۔۔ شش ہزار آیتِ احکام ہنر باختہ ام

اسی رنج و غم میں دفعتہً بلند ہمتی اور عالی حوصلگی کے جوش میں آ کر کہتا ہے اور کیا خوب کہتا ہے،

گفتہ گر شد ز کفم شکر کہ ناگفتہ بجاست ۔۔۔ از دو صد گنج یکے مشت گہر باختہ ام

اس خیال کو، کہ "اگر پچھلا کلام جاتا رہا تو مضائقہ نہیں پھر کہہ لوں گا"، کس لطیف شاعرانہ پیرایہ میں ادا کیا ہے، یعنے "اگر کہا ہوا جاتا رہا تو پرواہ نہیں، شکر ہے، کہ بن کہا ہوا تو موجود ہے،

مرنے کے وقت اپنا دیوان جو اُس کے ہاتھ کا مسودہ تھا عبدالرحیم خانخانان کے کتب خانے میں بھیج دیا تھا، کہ مدوّن کر دیا جائے، چنانچہ خانخانان نے محمد قاسم مشہور بہ سراج کو اس کام پر مامور کیا، سال بھر کی شبانہ روز کی محنت میں، دیوان کی ترتیب پوری ہوئی، کل چودہ ہزار شعر تھے، خانخاناں نے اس محنت کے صلے میں سراج کو انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا قاسم نے ایک قطعہ میں ان واقعات کا ذکر بھی کیا ہے،

عرفیِ آں واضعِ سخن کہ بر اُو ۔۔۔ رشک دارد، روانِ شروانی
نہ کہ شروانی ست در رشکش ۔۔۔ بلکہ ہم رونیِ وصفاہانی

[1] مآثر رحیمی،

بعد چندے چو جائے بودن نیست | رفت ازیں دیر ششدر فانی
مانداز وُ دُرّ شاہوارے چند | کش قرین نیست بحر و کانی
صورتے چند جملہ با معنے | خلفے چند جملہ روحانی
لیک آں جملگی پراگندہ | ہمہ از بے سری و سامانی
آں قدر مہلتش نہ داد اجل | کہ بہ ترتیب شان شود بانی
گفت با دوستاں بہ گاہ وداع | کاے عزیزان جسمی و جانی
برسانید زادہائے مرا | بہ جناب معلم ثانی
صاحب حلم و علم و سیف و قلم | خان خاناں سکندر ثانی
دید چوں زادہائے عرفی را | ہمہ محمود لعل پیکانی
بعد یک چند، بندہ را فرمود | کہ دہم شان نظام دیوانی
مدتے چند خون دل خوردم | تاکہ جمع آمد از پریشانی
از خرد خواستم چو تاریخش | گفت ترتیب دادہ نادانی

ترتیب دادہ سے ترتیب کی تاریخ نکلتی ہے، عبد الباقی نے اس پر ایک دیباچہ بھی لکھا ہے جس میں عرفی کے حالات اور واقعات درج کیے، چنانچہ مآثر رحیمی میں اس کا ذکر کیا ہے، افسوس یہ نسخہ آج بالکل نایاب ہے، ورنہ غالباً بہت ہی دلچسپ باتیں معلوم ہوتیں، صمصام الدولہ شہنواز خاں نے تذکرۂ بہارستان سخن میں لکھا ہے کہ عرفی کا ضائع شدہ کلام بھی آخر ہاتھ آیا اور دیوان میں داخل کر دیا گیا، لیکن جو نسخے اس سے پہلے شائع ہو چکے تھے وہ ناقص رہے یہ بیان قرین قیاس معلوم ہوتا ہے، میں نے عرفی کے دیوان کے نسخے باہم مختلف دیکھے ہیں، میرزا صائب نے اپنی بیاض میں عرفی کے اکثر اشعار انتخاب کئے ہیں،

جو موجودہ دیوانوں میں نہیں ملتے۔

کلام پر رائے

اس قدر مسلم ہے کہ اصناف سخن میں سے عرفی مثنوی اچھی نہیں کہتا تھا چنانچہ اس کے ایک معتقد خاص نے بھی تسلیم کیا،

مثنویش رنگ فصاحت نداشت　　کان نمک بود و ملاحت نداشت

اس سے بھی انکار نہیں ہوسکتا کہ اس کے کلام میں جابجا خامی پائی جاتی ہے، لیکن ان سب باتوں کے ساتھ وہ ایک طرز خاص کا موجد ہے، اور آج تک تمام شعرا اسکی تقلید کرتے آتے ہیں، مآثر رحیمی میں ہے،

مخترع طرز تازہ ایست کہ الحال مستعدان واہل زبان وسخن سنجان تتبع اومے نمایند،

ایک عجیب بات یہ ہے کہ اس کی شاعری کی شہرت قصیدے میں ہے، لیکن وہ کہتاہی،

قصیدہ کار ہوس پیشگان بود عرفی　　تو از قبیلۂ عشقی وظیفہ ات غزل ست

عرفی کی نسبت معاصرین شعرا کی رائے

میرزا صائب نے اس کا رتبہ نظیری سے کم قرار دیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں،

صائب چہ خیال ست شوی ہمچو نظیری　　عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

نظیری نے ایک ہم طرح قصیدے میں عرفی کے اشعار کا رد لکھا ہے، ہم اُن کو اس موقع پر نقل کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوگا کہ نظیری جیسا شخص باوجود پوری کوشش کے عرفی کی شاعری پر اعتراض کرنے میں کامیاب نہ ہوسکا،

دگر کہ گفت مباد از راوی شعرم　　دریں قصیدہ بروز کمال بنشانی

ترا کہ فضل بحدے بود کہ در بزمت　　طیور وقت ترنم کنند سبحانی

کمال جہل وبلاہت بود کہ طعنہ زنار　　بہ نقص مایہ کج فہمی و غلط خوانی

عرفی نے اپنے قصیدہ میں کہا تھا کہ میرا قصیدہ کسی غلط خوان سے نہ پڑھوایا جائے، ورنہ میرا بھی وہی حال ہوگا جو کمال اسماعیل کا ہوا تھا، اس پر **نظیری** اعتراض کرتا ہے کہ خانخانان کی مجلس میں جانور بھی سحبان ہیں، اس لئے یہ اندیشہ کرنا کمال حماقت ہے،

دگر نبود ز شرط ادب در آوردن   بہ سلک مدح تو مدح حکیم گیلانی

گر او بہ فضل فلاطون ست برکشیدہ تیست   بود بقرب کیان اعتبار یونانی

اگرچہ سایہ زرفعت زمین فرو گیرد   ولے نہد بہ پے آفتاب پیشانی

عرفی نے خانخانان کے مدحیہ قصیدہ میں حکیم ابوالفتح کی مدح بھی لکھی تھی، اس پر نظیری اعتراض کرتا ہے کہ ابوالفتح کی آپ کے سامنے کیا حقیقت ہے، وہ آپ ہی کا ساختہ پرداختہ ہے اس لئے آپ کے ذکر کے ساتھ اس کا ذکر موزون نہیں،

دگر چہ ابر دُرافشان شود کسے نہ کند   کلاہ بادشہی را کلاہ بارانی

عرفی نے خانخانان کی مدح میں لکھا تھا کہ ابوالفتح کے غصہ کا بادل جب برستا ہے تو لوگ تیری محافظت کی بارانی ٹوپی ڈھونڈھتے ہیں، **نظیری** کا یہ اعتراض ہے کہ خانخانان کے پادشاہانہ تاج کو کلاہ بارانی نہیں کہنا چاہئے تھا،

اگرچہ کشور چین پر ز نقش مانی بود   خراب گشت نہ صورت بجاست نہ مانی

یہ شعر عرفی کے اس شعر کے جواب میں ہے،

ذخیرۂ نہد از من کہ مانی از صورت   تمتّعے برم از وے کہ صورت از مانی

اعتراض یہ ہے کہ اب نہ مانی موجود ہے، نہ اُس کی بنائی ہوئی تصویریں، اس لئے عرفی نے ممدوح کو مانی سے کیوں تشبیہ دی، ان اعتراضات کی جو وقعت ہے، ناظرین خود اندازہ کرسکتے ہیں، لطف یہ ہے کہ ان اعتراضات کے ساتھ نظیری نے خود اخیر میں عرفی کے تتبّع کا قصد

کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے،

بطرزِ وے دو سہ بیتے دگر ادا سازم | کہ بہر دعوئے او قاطع ست برہانی

عرفی کے لئے یہ فخر کیا کم ہے، کہ نظیری جیسا شخص اُس کی تتبع کا قصد کرتا ہے، نظیری کو عرفی کے کمال سے انکار ہے تو ہو، لیکن ملک الشعرا فیضی اس کی نسبت ایک خط میں لکھتا ہے،

از یارانِ دمساز و غمخواران ہمراز کہ دل از صحبت او آب مے خورد مولانا عرفی شیرازی ست کہ دریں نوروز بہ قدوم خود بر خاک نشینان ایں دیار منت نہادہ اند، بہ حق دوستی کہ ازیں عظیم تر سوگندے نمے داند کہ بہ بلندی و وفورِ قدرت و ایجاد معانی، و چاشنی الفاظ، و سرعت فکر و دقت نظر فقیر کسے را چوں او ندیدہ و نشنیدہ، و از تہذیب اخلاق چہ گوید کہ در خاکی نہاد شیراز ذاتی مے باشد نہ کسبے، چند بیت ایشاں بالفعل حاضر بود در حاشیہ ایں صحیفہ نوشتہ آمد،

بعد مُردن برائے باد ابجائے خاکم | کہ فشانند مصیبت زدگان برسر خویش

اے زلف عروس شادمانی شب تو | آرایش بزم بیغمی، مشرب تو

انباشتہ ہجران بہ نمک داغ دلم | اما نہ ازاں نمک کہ دارد لب تو

عشق آمد و رفت خون چکان در بازار | زہد آمد و کرد نقد تزویر نثار

آں پنبہ داغ جُست و ایں پنبۂ گوش | زاں حبل متین تافتہ شد زین زُنّار

ملا عبد القادر بدایونی لکھتے ہیں کہ عرفی کا کلام گلی گلی اور کوچہ کوچہ میں کتب فروش بیچتے پھرتے ہیں، اور اہل عراق اور ہندوستانی تبرکاً لیتے ہیں" اس سے بڑھ کر حسن قبول کی کیا دلیل ہوگی،

عرفی کا کلام

عرفی کی عمر ۳۶ برس سے زیادہ نہیں ہونے پائی، ابوالفضل کی دراندازی نے اس کو دربار میں کامیاب نہیں ہونے دیا، تمام ہمعصر شعرا اس سے ناراض تھے اس کے کلام میں کثرت سے ناہمواریاں اور خامیاں ہیں، ان سب باتوں پر بھی اکبری دور میں جس قدر اس کا نام روشن ہوا کسی کا نہ ہوسکا، اور اب بھی اس کے قصائد، تمام ہندوستان کے مکاتب میں داخل نصاب ہیں، اس سے خود بخود قیاس ہوسکتا ہے کہ اس کے کلام میں ایسے جوہر ہیں جن کی چمک کو کوئی چیز نہیں مٹا سکتی،

حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک طرز خاص کا موجد ہے، عبدالباقی جو خود اُس کا معاصر ہے لکھتا ہے،

مخترع طرز تازہ ایست کہ الحال درمیانہ مستعدان واہل زمان معروف ست وسخن سنجان تتبّع اومے نمایند،

اس کے کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں،

زور کلام

۱- زور کلام جس کی ابتدا نظامی نے کی تھی، عرفی نے اس کو کمال کے درجہ تک پہنچا دیا، زور کلام ایک وجدانی چیز ہے جس کا اندازہ صرف مثالوں سے ہوسکتا ہے، مجملاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ الفاظ کی شان وشوکت، بندش کی چستی، فقروں کا دروبست، خیالات کی رفعت، مضامین کا زور، اس کے ضروری عناصر ہیں، عرفی کے کلام میں یہ تمام باتیں موجود ہیں، مثلاً

آہنین پنجۂ تیغش بہ اجل گفت کہ من — موج بر موج شکستم چو بہ عمان رفتم

اگر نہیب دہد چرخ واژگون گردد — دگر عتاب کند آفتاب خون گردد

دوش بر دوش قضا دست در آغوش قدر — آمد از پردہ بروں، پردگیِ صنع خدائے

چمن آید بہ چمن بہر تماشائے جمال — بلبل آید بسر بلبل بہ تمنائے غزل

مرحبا اے نظر بخت تو کیوان پرور   مرحبا اے گہرِ ذاتِ تو امکان آرائے

ہر سر موئیش اگر باز شگافی بخرد   سومناتے است کہ چندیست درولات وہبل

اس مضمون کو کہ ممدوح بڑے بڑے سلاطین کو شکست دیتا ہے، اس انداز سے ادا کرتا ہے،

رمح او گویدا اگر جنگ وگر صلح کہ من   بہ کشاد گرہِ جبہۂ خاقان رفتم

یعنے اُس کا نیزہ کہتا ہے کہ لڑائی ہو یا صلح، میں ہمیشہ خاقان چین کی پیشانی کے بل کھول دیا کرتا ہوں،

اس مضمون کو کہ میں معشوق کی وجہ سے ذلتیں اُٹھاتا ہوں یوں ادا کرتا ہے،

زاں شکستم کہ بہ دنبال دل خویش مدام   در نشیب شکن زلف پریشان رفتم

دشمن کے مرعوب ہونے کو اس طرح ظاہر کرتا ہے،

زرعشہ باطن خصمت چو جعد جور و شان   شکن بروئے شکن خم بروئے خم چیند

ممدوح کے جود و کرم، جاہ و جلال، حکومت و اقتدار کو یوں ادا کرتا ہے

فارس حکمش بہ جولان رفت و گفت   آفتابم گوست، چوگان میزنم

یعنی اُس کے حکم کا سوار میدان میں گیا اور بولا کہ، آفتاب ایک گیند ہے جس سے میں کھیل رہا ہوں،

گفت جاہش دہر بر من تنگ شد   چاک در افلاک و ارکان میزنم

یعنی اُس کے دبدبہ نے کہا کو زمانے میں اب میں سما نہیں سکتا، اس لئے افلاک اور عناصر کو چاک کئے دیتا ہوں،

گفت جودش سیم و زر در کان نماند   سکۂ بر پیشانی کان میزنم

یعنی اُس کی سخاوت نے کہا کہ چاندی اور سونا کان میں نہیں رہا، اس لئے خود کان کی پیشانی پر سکّہ لگاتا ہوں،

اس بات کو کہ اگر ممدوح کے خلاف مزاج کوئی شخص بات کہے، تو فوراً واپس لیگا یوں ادا کرتا ہے،

ہر حدیثے کہ رضایت بسماعش نبود　　از درِ گوش سراسیمہ، بلب گردد باز

یعنی جو بات کہ اس کے سامعہ کے خلاف مرضی ہو، وہ کان تک آکر سخت بدحواسی کے ساتھ بولنے والے ہونٹوں کی طرف پلٹ جائے گی،

اس بات کو کہ حریف کس برتے پر میرا مقابلہ کر سکتا ہے اس طرح ادا کرتا ہے،

خصم و طرزِ سخنِ من، بچہ فہم و بچہ درک　　غیر و نظمِ گہرِ من، بچہ برگ و بچہ ساز

ممدوح کی تحریض اور نعرۂ جنگ سے بہادری کے عام اثر پیدا ہو جانے کو اسطرح ادا کرتا ہے،

اگر بصحن چمن فی المثل شجاعت او　　دہد نہیب کہ ہیں یاسمین وہان نرگس

ق

چو عکس لالہ زند، یاسمین در آب آتش　　چو شاخ بید کشد، خنجر از میان نرگس

یعنی اگر اس کی شجاعت باغ میں ڈپٹ کر چنبیلی اور نرگس سے کہے کہ ہاں لینا، تو چنبیلی لالہ کے عکس کی طرح پانی میں آگ لگادے گی، اور نرگس، بید کی شاخ کی طرح کمر سے تلوار کھینچ لے گی،

نہیب، ہیں وہاں، آتش در آب زدن، خنجر از میان کشیدن، یہ الفاظ اور عکس لالہ اور شاخ بید کی تشبیہ، ان سب باتوں نے مل کر کلام میں کس قدر زور پیدا کر دیا ہے،

چونکہ اس کا کلام عموماً پر زور ہوتا ہے، اس لئے چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا، آگے اور اور

عنوانوں کے ذیل میں جو اشعار آئیں گے اُن پر زورِ کلام کی حیثیت سے بھی نظر ڈالنی چاہیئے

۲۔ الفاظ کی نئی نئی ترکیبیں، عرفی نے سینکڑوں نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے استعارے پیدا کئے جن سے جدّت اور طرفگی کے علاوہ نفسِ مضمون پر خاص اثر پڑتا ہے مثلاً

خیز و شراب جبرتم زاں قدحِ جلوه ساز ده — روے بروے حُسن کن، دست بدست ناز ده
مریمی کن تو کہ فرزندِ مسیح است و مسیح — حاتمی کن تو کہ اقبال گدائے ست و گدائے
مرحبا اے زعنایاتِ ازل رمز فروش — مرحبا اے بہ علاماتِ ہُنر خویش ستائے
ناخنِ قدرتِ او پردۂ تحقیق شگاف — خامۂ دولتِ او چہرۂ توفیق کشائے
گُلِ اندیشۂ من سحر غلط، معجزه رنگ — بلبلِ نطق، من الہام غلط، وحی سرائے
بر بُرقع مہ کنعاں کہ بود حُسن آباد — بہ حجلہ گاہ زلیخا کہ بود یوسف زار
بہ تیشۂ کہ بر اطراف صورتِ شیریں — ہمہ کرشمہ تراشید و ریخت بر کہسار
بہ نخل و عادہ تراش و قناعت عیاش
کہ گر شود، رہِ کوے تو جملہ نشتر خیز — کنم بہ مردمکِ دیدہ طے نشتر زار
بہ روش مہر فزا و بہ نگہ صبر گداز،

یہ ترکیبیں جس قدر بدیع ہیں، اُسی قدر مضمون میں زور اور وسعت پیدا کرتی ہیں، فرض کرو اگر یہ کہنا چاہیں کہ مجلس میں کثرت سے خوش جمال جمع تھے تو یہ مضمون جس وسعت کے ساتھ صرف اس لفظ سے ادا ہو سکتا ہے کہ "مجلس یوسف کدہ بن گئی تھی" سینکڑوں الفاظ میں ادا نہیں ہو سکتا،

اسی طرح نشتر خیز، معجزہ رنگ، رمز فروش، کیوان پرور، امکان آرائے، حُسن آباد

صبر گداز، وغیرہ ترکیبوں سے مضمون میں جو زور، وسعت، اور رنگینی پیدا ہوتی ہے، محتاج اظہار نہیں، اسی قسم کی ترکیبیں، متوسطین اور متاخرین کی خاص ایجاد ہیں، عرفی اگران کی ایجاد کا خدائے یکتا نہیں تاہم خدا ضرور ہے،

جدت استعارات وتشبیہ

۳- عرفی کے کلام کی خصوصیات میں سے ایک بڑی خصوصیت، استعارات کی جدت اور طرفگی ہے، یہ مسلم ہے کہ انشاپردازی اُسی قدر لطیف اور پُرزور ہوگی جس قدر استعارات لطیف اور پُرزور ہوں گے، عرفی نے استعارات کی جدت اور تنوع سے ایک گوناگون عالم پیدا کر دیا، ان میں بعض بے مزہ اور دور از کار ہیں، جیسا کہ صاحب آتشکدہ اور مجمع الفصحا کا خیال ہے، لیکن زیادہ تر ایسے ہیں، جو ایوانِ شاعری کے نقش ونگار ہیں، مثلاً

میر ابوالفتح کز سیاستِ او | غمزۂ زہرہ، خنجر اندازد
زاں طفل اشک من ہمہ خون شد کہ اوفتاد | دوش از دریچۂ دل وامشب ز بام چشم
دلم چو رنگ زلیخا شکستہ در خلوت | غمم چو تہمتِ یوسف دویدہ در بازار
پر چمِ رمح تو در آشوب گاہِ معرکہ | لیلۃ القدر یست در ہنگامۂ یوم الحساب

ع - بہ بر شگفتن امروز وغنچہ گشتن دی،

یعنی آج کا دن گویا ایک پھول ہے، جو کھل رہا ہے، اور کل کا دن کھل کر مرجھا گیا اور غنچہ بن گیا،

بہ خوے فشانی شبنم بہ خود فروشی گُل | بہ نیزہ بازی سوسن بدشنہ سازی خار
ز نور ناصیہ ات ماہ گر ضیا گیرد | بہ آفتاب دہد نسخۂ سنین وشہور

ع، چو صبح، بیضۂ خورشید پرورد بہ شکم،

ع، کہ بتابیدن سر پنجۂ مرجان رفتم،
پنجہ مروڑنا

بزمِ گاہ تو جلوہ‌ئے یوسف　　رزم گاہ تو ستانۂ ضحاک

دستِ مظلوم را چہ کرد دراز　　صد شبیخون بہ شعلۂ زد خاک

از خمِ مدتِ تو جامِ نخست　　جرعۂ دورِ آخرِ افلاک

یعنی تیری درازیِ عمر کی شراب کا پہلا جام، آسمان کا اخیر دور ہے؛

حسنِ لفظ بر قدِ معنی　　صد روش دوختی و کردی چاک

آسمان دریوزہ کرد و آفتابش کرد نام　　لعلے از آویزۂ گوشِ شبِ یلدائے من

خوردہ ہر دم صد شکست از فوجِ قدسی آشوبِ حسن　　شوق بے ہنگام ناز مست بے پروائے من

۴۔ عرفی کا زورِ طبع، اور فصاحت و بلاغت کا زور شور وہاں نظر آتا ہے، جہاں وہ قصاید میں کوئی مسلسل مضمون ادا کرتا ہے اور یہ اس کا خاص انداز ہے، مثلاً خانخانان کے بیٹا پیدا ہونے پر جو قصیدہ لکھا ہے، اس کی تمہید اس طرح شروع کی ہے،

بود در کتمِ عدم بکرِ طبیعت را جائے　　کہ خرد بر سرش استادہ ہمے گفت برآئے

چند در پردہ نشیند خلفِ دودۂ کون　　محرمے نیست مگر ہم تو شوی پردہ کشائے

مریمی کن تو کہ فرزندِ مسیح است و مسیح　　حاتمی کن تو کہ توفیق گدائے ست و گدائے

ایں سخن گوش زد بکرِ طبیعت چوں گشت　　خندہ زد گفت کہ رو صبر کن و ژاژ مخائے

گوشۂ گیر و جگر مے خور و تلخی مے کش　　تا بعہدے کہ شود صاحبِ تو ملک آرائے

خلق از مژدہ بر و مژدہ شنو، جمع شوند　　ہمہ جوہر طلب او جوہری او گنج ستائے

فلک آمادہ شود زہرہ مہیا گردد　　آں یکے حلہ طراز آید و ایں غالیہ سائے

من بصد ناز و کرشمہ ہمہ رنگ و ہمہ بوئے　　بر سرِ حجلۂ ارکان نہم از خلوت پائے

پس در آید بہ برم آں کہ نشں نام زدم　　او کشد بندِ نقابِ من و من بندِ قبائے

جسکے میں نامزد ہوں　　عناصر

نعت کی تمہید اس طرح لکھتا ہے،

آمد آشفتہ بخوابم شبے آں مایۂ ناز
بہ رَوِش جلوہ فزا دبہ نگہ صبر گداز

چہ پری چہرہ نگارے کہ ندارد مثلش
در پسِ پردۂ فطرت، فلک لُعبت باز

دیدم القصہ کہ خوش گرم عنان ست رواں
سُودم اندر قدمش چہرہ بصد عجز و نیاز

گفتم اے عربدہ جو چیست گناہم؟ کہ دگر
بہ تعرض ہمہ خشمی، بہ تغافل ہمہ ناز

گفت ایں خود نہ گناہ ست کہ ساکت شدۂ
از ثنا گستری شاہ سریر اعجاز

منفعل گشتم و فی الحال بہ وادی مدیح
مرکبِ طبع جہاندم، بہ ہوائے تگ و تاز

رہ نبردم بہ سر کشورِ معنے ہر چند
کہ دراں بادیہ راندم، بہ نشیب و فراز

گریہ آلود فتادم و گر اندر قدمش
گفتم اے مایۂ آرام دل اہل نیاز

از جبین، چین بکشا تا دل من جمع شود
کہ سراسیمہ کند مرغ خیالم پرواز

ایں سخن در دلش از درد اثر کرد و سرم
برگرفت از قدمِ خویش و بلطف آمد باز

بے حجابانہ زدم بوسہ ابد ستتش از شوق
گفتم اکنوں دہ اجازت کہ شوم وحی طراز

جہانگیر نے شاہزادگی کے زمانہ میں **عرفی** کا شہرہ سُنکر دربار میں بلایا چونکہ عرفی جہانگیر کا عاشق تھا ہمہ تن شوق اور بیتابی کے عالم میں گیا، جہانگیر نے نگاہ لطف سے دیکھا اور اشاروں میں باتیں کیں، پھر مُسکرا کر قصیدے کی فرمایش کی، اس دلچسپ داستان کو قصیدۂ مدحیہ میں ادا کرتا ہے،

صباح عید کہ در تکیہ گاہِ ناز و نعیم
گدا کلاہِ نمد، کج نہاد و شہ دیہیم

جہاں چنیں خوش، و من خوشتر آنچناں بہ وثاق
نشستہ با خرد اندر تعلم و تعلیم

کہ ناگہاں ز ورم در رسید مژدہ دہے
چناں کہ از چمن طالعم ز مغز شمیم

چہ گفت؟ گفت کہ "اے مخزنِ جواہر قدس" — چہ گفت؟ گفت کہ "اے مطلب بہشت نعیم
"بیا کہ از گہرت یاد مے کنند دریا — بیا کہ تشنہ لبت را طلب کند تسنیم"
(یعنے جہانگیر) (چشمہ بہشت کا،)
ازیں پیام دلم شد شگفتہ و شاداب — چناں کہ باغ ز شبنم چناں کہ گل ز نسیم
بہ رہ فتادم و گشتم چناں شتاب زدہ — کہ دستِ اہل کرم در نثار گوہر و سیم
چو روزگار رسیدم بہ درگہے کہ کند — زمانہ طوف حریمش بہ دیدۂ تعظیم
رسیدن من و اقبال آں ہمایوں فال — چنان فتاد مطابق دراں خجستہ حریم
کہ گر ادب نکشیدی عنان من قدمش — ببوسہ گاہ ہمے کرد بر لبم تقدیم

یعنی میرا وہاں پہنچکر زمین بوس کے لئے گرنا، اور شاہزادہ کا سامنے سے آنا اس قدر مطابق پڑا کہ اگر میں ادب سے رُک نہ جاتا تو بجاے اس کے کہ میرے لب اس کے قدم چومتے اُس کے قدم میرے لب کو چوم لیتے،

مرا چو دوش بدوش ادب بدید استاد — بہ لطف خاص بدل کرد التفات عمیم
رموزِ کُرنش و تسلیم را ادا کردم — بہ داب مردم دانا و بذلہ سنج ندیم
نگفت و من بشنودم ہر آنچہ گفتن داشت — کہ در بیان نگہش کرد بر زبان تقدیم

یعنی اُس نے کچھ نہیں کہا، لیکن میں نے سُن لیا کیونکہ اظہار مطلب میں اُسکی نگاہوں نے زبان سے پیش دستی کی، مطلب یہ کہ پہلے اشاروں میں باتیں ہوئیں،

لبش چو نوبت خویش از نگاہ باز گرفت — فتاد سامعہ در موج کوثر و تسنیم

یعنی جب ہونٹوں کی باری آئی (یعنے اُس نے تقریر شروع کی) تو میرا سامعہ کوثر کی موجوں میں ڈوب گیا،

بخندہ گفت کہ در عذر ایں گناہ بزرگ — کہ رفتہ نام تو بے حکم ما بہ ہفت اقلیم

همیں کہ رفتی ازیں آستان نوشتہ بیار — گر بدہ نسخۂ از زاد ہاے طبع سلیم

ابو الفتح کے دربار میں جب ملازمت کا تعلق کرنا چاہا ہے تو قصیدہ لکھ کر لے گیا ہے، اور عجیب لطیف پیرایہ میں اپنی ملازمت کی خواہش ظاہر کی ہے،

خدایگانا! دارم حکایتے برلب — کہ چوں مدیح تو نتواندم بہ لب استاد
خیال بندگیت دوش نقش مے بستم — زروے کسب شرف نے زروے استعداد
کہ ناگہ از دراندیشہ‌خانہ، شاہدِ عقل — کہ شمع خلوتِ اسرارِ مبدئست و معاد
کرشمہ سنج و تبسم کنان درآمد و گفت — کہ عیدِ بندگیِ صاحبت مبارک باد
من از تعجب ایں حرف دلکشا گفتم — کہ اے ز لطف کلامِ تو ملکِ ہزل آباد
نہ آسمانم و نے آفتاب و نے بہرام — کزیں مطایبہ گردم ز سادہ لوحی شاد
تو ہم ز حرف تنک مایہ تر (عطارد) زبان نشوی — بگو کہ صورتِ (ظرافت) ایں مژدہ، از چہ معنی زاد؟
جواب داد کہ ایں مژدہ را دلیلے ہست — کہ دستِ فطرتم آں را بہ الطاق حصر نہاد
همیں نفس، ادب آموز قدسیان جبریل — دریچۂ حرم قدس را بدیدہ کشاد
بسوے کاتب اعمال بانگ برزد و گفت — کہ اے رقم کش کردار خوب و زشت عباد
بشوے نامۂ عرفی کہ ایزد متعال — ز بندگانِ خودش برگزید و کرد آزاد
اگر نہ بندگی صاحبت بہ فال آمد — سبب چہ بود کہ جبریل ایں ندا در داد
من از متانتِ برہان بشرم غوطہ زدم — شکست بر رخِ اندیشہ رنگِ استعداد
بخدمت آمدم اینک بگو چہ مصلحت ست — بر آستانِ تو باید نشست؟ یا استاد

ان اشعار کا خلاصہ یہ ہے، ابو الفتح کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ اے مخدوم! کل میں آپ کی نوکری اور ملازمت کا خیال دل میں پکا رہا تھا وہ بھی اس بنا پر نہیں کہ میں اس

قابل ہوں بلکہ اس لئے کہ یہ میری عزت کا سبب ہے، اسی حالت میں عقل نے مجھ سے آکر کہا کہ لو مبارک، تم سرکار میں ملازم ہوگئے، میں نے متعجب ہوکر کہا کہ میں آسمان اور عطارد کی طرح سادہ لوح نہیں کہ اس مذاق پر یقین کر لوں گا، آخر اس کا کوئی ثبوت بھی، عقل نے کہا ابھی ابھی جبرئیل نے حرم قدس کے دریچے کھولے اور کاتب اعمال کو حکم دیا کہ **عرفی** کا نامۂ اعمال دھو ڈالو کیونکہ خدا نے اس کو اپنے برگزیدہ بندوں میں داخل کر لیا، میں اس دلیل کی متانت سے شرمندہ ہو گیا اور اب خدمت عالی میں حاضر ہوا ہوں، کیا ارشاد ہے؟ آستانۂ عالی پر بیٹھنے کی اجازت ہے یا مودب کھڑا رہوں،

اس قسم کی اور بہت سی مثالیں اس کے کلام میں موجود ہیں، جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک واقعہ کو کس ترتیب اور کس تسلسل اور کس شاعرانہ انداز سے ادا کر سکتا ہے،

۵۔ قصائد میں شعرا کی یہ مجال نہ تھی کہ بادشاہ کی مدح و ثنا کے سوا اپنا ذکر کر سکیں اور کبھی ایسا کرتے تھے تو صرف اپنی بیچارگی اور بیکسی کا اظہار کرتے تھے، زیادہ سے زیادہ یہ کہ حضور اور شعراء کی زیادہ قدر کرتے ہیں، حالانکہ میں اُن سے بڑھکر ہوں **عرفی** چونکہ بالطبع نہایت غیور اور خوددار تھا، اس لئے مجبوری اور ضرورت کی وجہ سے امراء اور سلاطین کی مدح کرتا تھا لیکن ساتھ ہی اپنے فضائل اور اوصاف بھی جی کھول کر بیان کرتا، اور مزے لے لیکر کہتا تھا، شاید ہی کوئی ایسا قصیدہ ہو جس میں ایک دو شعر فخریہ نہ ہوں، شہزادہ سلیم کی مدح میں خودستائی کا بالکل موقع نہ تھا، تاہم کہتا ہے،

خدایگانا! گویم بہ مدح خویش دو بیت   کزاں نیارد پرہیز کرد طبع سلیم

(یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ کم سے کم دو شعر بھی مدح کے نہ کہوں اس کے بعد دو شعر فخریہ لکھے ہیں)

اہل ادب نے انواع شاعری میں **فخریہ** کو ایک خاص صنف قرار دیا ہے، فارسی

ہیں اس خاص صنف میں عرفی کا کوئی ہمسر نہیں، عجیب عجیب نئے اسلوب سے فخریہ لکھتا ہے اور اس جوش سے لکھتا ہے کہ آپے سے باہر ہوا جاتا ہے، ایک قصیدہ میں ممدوح کو خطاب کرکے کہتا ہے عرفی کا غرور اب حد سے بڑھ گیا، آپ کبھی اس کے شعروں کی تحسین نہ کیجئے پھر اپنی تمام خوبیوں کو عیب کے پیرایہ کے بہانہ سے ذکر کر جاتا ہے،

داد یک شہر ز عرفی بستان کین مغرور | کبر و نازش نہ باندازۂ قدر است و محل
نیم تحسین مکن ار گوید صد بیت بلند | کہ دماغش شدہ از حسن طبیعت مختل

عرفی اگر سیکڑوں عمدہ شعر کہہ جائے تب بھی اُس کی تعریف نہ کیجئے، کیونکہ اُس کا داغ، حُسن طبیعت کے غرور سے مختل ہو گیا ہے

ہر سر مویش اگر باز شگافی بخرد | سومنات یست کہ چیدہ است در و لات و ہبل

عرفی کا ایک ایک بال چیر کر دیکھا جاتے تو ایک سومنات نظر آتے گا جس میں بُت چُنے ہوتے ہیں

بہر اصل و نسب خویش نویسد بیروں | ہر چہ خواہد ز نسب نامۂ ارباب دول

عرفی تمام ارباب دول کے نسب نامے، اپنے نسب میں ملا لیتا ہے،

گوہر آمای رموز ست و نہ دریا و نہ کان | حکمت آموز عقول ست و نہ علم و نہ عمل

دریا ہے اور نہ کان، باوجود اسکے دعویٰ کرتا ہے کہ راز کے موتی میری خزانہ میں ہیں، نہ علم ہے نہ عمل، باوجود اسکی عقول عشرکو حکمت سکھاتا ہے

چہ بلا عیب تراشم کہ حسد کم بادا | مشنو عیب زر دہد ہی از سیم و غل

میں کس بلا کا عیب جو ہوں، آپ خالص سونے کا عیب، کھوٹی چاندی سے نہ سُنئے

آنچہ ذرات معانی ست کہ بر وے جوشند | ہمہ خورشید شود گر بشناسند محل

مضامین کے ذرّے جو اُس کے دل میں چمکتے ہیں، وہ اگر اپنا رُتبہ پہچانیں تو سب آفتاب بن جائیں،

دارد از عزتِ اصل گہر و ذلت شعر | پاے در تحت ثریٰ دست در آغوش زحل

خاندان
یعنی خاندانی اعزاز اور شعر کی ذلت کی وجہ سے اس کے پاؤں تو تحت الثریٰ میں

ہیں لیکن ہاتھ زحل کی آغوش میں ہے،

عزت اونہ شہیدی ست کہ حشرش باشد	ورنہ نگر یستمے از ستم مدح و غزل
اگر او نامزد ننگ شد از ذلت شعر	شعر از عزت او نیک بر آید ز ذلل

یعنی عرفی تو شعر کی وجہ سے ذلیل ہوا، لیکن فنِ شعر معزز ہو گیا،

اکبر کے دربار میں خودستائی کی کس کو جرأت ہو سکتی تھی تاہم کہتا ہے،

شہا! بہ بزم تو چوں ایں قصیدہ برخوانم	کہ ملک نظم ز فیضش گرفتہ است نظام
سزد بجایزہ باجیب پُر گہر گردون	بدوشم افگند ایں جامۂ زمرد فام

عرفی نے قصائد میں جس قسم کی خودداری کے خیالات کی ابتدا کی تھی، اگر اُس کی طرف عام خیالات کا میلان ہو گیا ہوتا تو شاید یہ صنف کسی اچھے کام کا مصرف بنجاتی،

مضمون آفرینی

۶- عرفی کی مضمون آفرینی اور نازک خیالی کا دوست اور دشمن دونوں نے اقرار کر لیا ہے اس میں مطلق شبہہ نہیں ہو سکتا کہ اُس کی قوت تخیل نہایت زبردست تھی، لیکن اس زمانہ کا مذاق یہ تھا کہ یہ قوت صرف مبالغہ، جدت تشبیہ، اور حُسن تعلیل وغیرہ پر صرف کی جاتی تھی، عرفی کا زور بھی انہیں فضول چیزوں پر ضائع ہوا، تاہم جو نمونے موجود ہیں اُن سے یہ قطعی اندازہ ہو سکتا ہے کہ اگر اس سے بجا طور پر کام لیا جاتا تو شاعری کی سرحد کہیں سے کہیں پہنچ جاتی، ہم چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں،

آں کہ چوں در کتف چترِ ہمایون آثار	ہم عنان ظفر از راہ غزا گردد باز
زہرہ گیسو بکشاید کہ شود گرد فشاں	از رکابش کہ پذیرفتہ غبار از تگ و تاز
فتح گوید چہ کنی چشم من ست ایں رکاب	سرمۂ چشم جہاں بین مرا پاک مساز

یعنی جب رسول اللہ چتر کے سایہ میں میدان غزا سے واپس آتے ہیں تو زہرہ چوٹی

کھول کر چاہتی ہے کہ رکابوں پر جو گرد پڑ گئی ہے اس کو جھاڑ دے - فتح کہتی ہے اَیں! یہ
کیا کرتی ہے؟ یہ رکاب تھوڑی ہی ہے یہ تو میری آنکھیں ہیں، اس کے سرمہ کو گرد کو سُرمہ
قرار دیا ہے، کیوں چھڑاتی ہے،

احتساب تو اگر عارض نہی افروز | اے سراپردۂ عصمت ز تو با زینت و ساز
زخمہ ہر چند کہ انگشت نہد بر لبِ تار | نغمہ از بیم نیارد کہ برآرد آواز

یعنی اگر آپ کا احتساب ظہور میں آئے تو مضراب گو کتنا ہی تار کو چھیڑے لیکن نغمہ
کبھی ڈر کے مارے آواز اونچی نہ کر سکے،

ہر حدیثے کہ رضایت بسماعش نبود | از درِ گوش سراسیمہ بلب گردد باز
لوحش اللہ ز شبگیر سمند تو کہ ہست | دود مان کسل از شوخی او متاصل
آں سبک سیر کہ گر گرم عنانش سازی | از ازل سوے ابد و ز ابد آید بہ ازل
قطرہا کش دم رفتن چکد از پیشانی | شبنم آساش نشیند گہ رجعت بہ کفل

یعنی گھوڑا اس قدر تیز رفتار ہے کہ اگر تو اس کو دوڑائے تو ازل سے ابد اور ابد سے
ازل تک کا چکر اتنی دیر میں لگا آئے گا کہ جاتے وقت اس کی پیشانی سے جو قطرے ٹپکیں گے
وہ واپسی میں اس کے پٹھوں پر ٹپکیں گے اور زمین پر نہ گرنے پائیں گے،

طرزِ ادا کی جدّت

عرفی جدت ادا کا گویا موجد ہے، اور اس کا ہر شعر جدت کی ایک نئی مثال
ہے، جو اشعار اوپر گذر چکے اُن میں بیسیوں مثالیں ملیں گی، اس لئے ہم صرف چند اشعار
پر اکتفا کرتے ہیں،

مو بمویم دوست شد ترسم کہ ز ابتلائے عشق | یک انا الحق گوئے دیگر بر سر دار آورد
اے برہمن چہ زنی طعنہ کہ در مسجد ما | سبحۂ نیست کہ آں غیرت زنار تو نیست

در دل شکنی آفت دہر ست نگاہش
طفلے کہ پدر مے شکند طرفِ کلاہش

ساقی توی و سادہ دلی بین کہ شیخ شہر
باور نمے کند کہ ملک مے گسار شد

زخمہا برداشتیم و فتحہا کردیم لیک
ہرگز از خون کسے رنگین نشد دامانِ ما

فارغ ز خیرگی نگرد، روے آفتاب
این دیدہ آزمودۂ نظارۂ کسے ست

گوش معزول ست در خلوت گہ ارباب راز
دود شمع خلوتِ ایشاں بہ روزن دشمن ست

لباسِ صورت اگر واژگون کنم، بینند
کہ خرقۂ خشنم مایۂ طلا باف ست

ایما و اشارت نہ باندازۂ راز ست
این رشتہ بانگشت نہ پیچی کہ دراز ست

نسبت سبحہ و زنار دو صد رنگ آمیخت
ورنہ این رشتہ ہماں ست کہ آدم مے رشت

عشق اگر غم داد و جان و دل شد عیبش مکن
بیع اول بود و آشوبِ خریدارے نبود

زنند طعنہ بمحشر بہشت جویان را
کہ این گروہ رعایاے ہمتِ پستند

شہید مضطرب بے خاک شد، مگر برہت
کہ بے نسیم براہِ تو گرد مے خیزد

ہلاک جوہرِ شمشیرِ ناز خوبانم
کہ تا ز زخم جدا گشتہ زنگ مے گیرد

مدار جلوہ دریغ از دلم کہ خرمنِ حسن
بخوشہ چینی آئینہ کم نمے گردد

دل نشد فرزانہ و عقل از فسون دلگیر شد
بر جنون افزودمش تا قابل زنجیر شد

فسانہا کہ بیازیچہ، روزگار سرود
کنوں بمسند جمشید و تاج کے بستند

کمند کوتہ، و بازوے سست، و بام بلند
بمن حوالہ د نومیدیم گنہ گیرند

کلید میکدہ ہارا بمن دہید کہ من
نہ آں کسم کہ باندازہ مست مے گردد

چہ بطاعت طلبی، برہمناں را زاہد!
تو ریا ورز کہ این طایفہ کارے دارند

علوئی ہمت

بساطے کاندرو طرح دو عالم مے تواں کردن
بدست آوردہ ام، اندازۂ و پر کار مے باید

به بطورِ مانه گنجد، منع دیدار — ولے ایں راز، با موسے بگوئید

دہر مرد افگن بہ میدانم کند تکلیف و من — ایں متاع افتادہ بر بالاے بسترمے خرم

صدق دوستی

مہر پیمائی مجوازمن کہ من ایں جنس را — غائبانہ مے فروشم، در برابر مے خرم

تمام بود بیک حرفِ گرم دما غافل — حکایتے کہ ہمہ ناتمام مے گفتند

بلند ہمتی

بہ آفتاب ازاں ذرہ را در اندازند — کہ عذر مردم کامل بہ ناکسے نہ نہند

مو بمویم رشتہ زنار شدواز ناکسے — در خرابات مغان بد نام اسلامم ہنوز

عشقیہ شاعری

عرفی ایک طرف تو نکتہ سنج اور نکتہ شناس اور ذوق عرفان سے آشنا تھا، دوسری طرف، شباب میں نہایت خوش رو اور حسین اور لوگوں کا منظور نظارہ چکا تھا، ہندوستان میں آیا تو شہزادہ جہانگیر پر عاشق ہوا، ان اسباب کی بنا پر وہ عشق اور محبت کی ایک ایک ادا سے واقف تھا، وہ کہیں عشق حقیقی کے اسرار اور دقائق بیان کرتا ہے اور کہیں مجازی عشق میں جو واردات اور معاملات پیش آتے ہیں، اُن کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس عالم میں بھی وہ اپنے تمام ہمعصروں سے اس بات میں ممتاز ہے کہ وہ سطحی اور سرسری وارداتیں نہیں بیان کرتا بلکہ گہرے اور دقیق معاملات پر اُس کی نظر پڑتی ہے اور انہیں کو شاعرانہ انداز میں ادا کرتا ہے،

شوق دیدار میں عاشق ہمہ تن نظارہ بن جاتا ہے، اس حالت کو یوں ادا کرتا ہے،

چگونہ بالغ نظارہ ام شوی کہ مرا — زشوق روے تو، سر تا قدم نگہ خیزست

استیلاے عشق کی حالت میں ہر قسم کے عام جذبات بھی عشق ہی کا رنگ اختیار کر لیتے ہیں، مثلاً عشق کی حالت میں اگر کوئی دنیوی صدمہ بھی پیش آتا ہے تو وہی مزہ دیتا ہے جو عشقیہ صدمات سے حاصل ہوتا ہے، اس حالت کو ادا کرتا ہے،

در دلِ ما غمِ دنیا غمِ معشوق شود باده گر خام بود پختہ کند شیشۂ ما

کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معشوقوں کے سامنے جب کوئی انکا ناز بردار نہیں ہوتا تو آپ ہی آپ بگڑتے ہیں، اور گویا خود اپنے آپ پر ناز افشانیاں کرتے ہیں۔ اس مخصوص اور مخفی حالت کو بیان کرتا ہے،

فغان زغمزۂ شوخی کہ وقت تنہائی بہانۂ بخود آغاز کردہ در جنگ ست

جوشِ حسن میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معشوق آئینہ دیکھ کر، خود اپنے آپ کو پیار کرنے لگتا ہے اس حالت کو دکھاتا ہے،

دہن خویش ببوسند ولب خویشں مکند چوں در آئینہ ببینند بتاں صورت خویش

معشوق لطف اور نوازش کے ذریعہ سے عاشق کا دل مسخر کرسکتے ہیں، لیکن عموماً وہ ایسا نہیں کرتے، بلکہ ظلم پسندی کی وجہ سے اس کے بجائے ناز اور قہر وعتاب سے کام لیتے ہیں، اس معاملہ کو عجیب لطف سے بیان کیا ہے،

بہ ملک ہستی من رو نہادہ سلطانی کہ ما بصلح دہیم او بجنگ مے گیرد

یعنی ہمارے ہستی کے ملک پر ایسے بادشاہ نے چڑھائی کی ہے کہ ہم صلح سے دیتے ہیں لیکن وہ خواہ مخواہ لڑ کر لیتا ہے،

معشوق یوں تو ہر وقت جلوہ فروشی کیا کرتے ہیں، لیکن کوئی تقاضا کرے تو رک جاتے ہیں اور ترساتے ہیں، اس کیفیت کو ادا کرتا ہے،

حُسن را از شیوہ ہا گاہے بود میلے بناز ورنہ موسے بے طلب صد رہ تماشا کردہ بود

عاشق، ہجر کے زمانہ میں معشوق کی ایک ایک بات اور خصوصاً اُس کی معشوقانہ نگاہوں کو حافظہ کے خزانے سے ڈھونڈ کر نکالتا ہے، اور اُس سے مزے لیتا ہے یا اُس پر حسرت

کرتا ہے اس واقعہ کو یوں بیان کرتا ہے،

ہرمتاعے کز نگاہش مے خرم در روز وصل   مے نشینم گوشۂ و از خود مکرر مے خرم

ابتدائے عشق میں ہمہ وقت جوش اور درد و گداز ہوتا ہے اُس کی تصویر کھینچتا ہے

عشق مے گویم و مے گریم زار   طفل نادانم و اول سبق ست

معشوق سے خواہش کرتا ہے کہ ستانا ہے تو ہم کو ستا کہ ہم پہلے ہی سے زخمی ہیں اور ہمارے ستانے میں تجھ کو اور خود ہم کو زیادہ مزہ آئے گا،

ہرگاہ کہ از لطف بہ کین میل تو بیش ست   اول نمکِ سینۂ ما پاش کہ ریش ست

یعنی چونکہ تمہارا امیلان بہ نسبت لطف کے ظلم کی طرف زیادہ ہے اس لئے پہلے ہمارے سینہ پر نمک چھڑکو کہ وہ پہلے ہی سے زخمی ہے،

معشوق اگر ہمیشہ ظلم اور بے اعتنائی ہی کیا کرے، تو عاشق اس کا خوگر ہو کر ایک اطمینانی حالت پیدا کرلے لیکن مصیبت یہ ہوتی ہے کہ معشوق کبھی کبھی لطف اور نوازش کی بھی چاشنی چکھا دیتے ہیں، اس کے بعد سرد مہری، اور زیادہ چرکے دیتی ہے، اس کیفیت کو ادا کرتا ہے،

ازاں بہ دردِ دگر ہر زمان گرفتارم   کہ شیوہ ہائے تُرا باہم آشنائی نیست

یعنی اس لئے ہر وقت میں ایک نئی مصیبت میں گرفتار رہتا ہوں کہ تیری ادائیں ایک دوسرے سے نہیں ملتیں،

شفائی نے اس مضمون کو زیادہ صاف اور واضح کر دیا ہے، لیکن وہ ابہام کا مزہ جاتا رہا وہ کہتا ہے،

ایں جور دگر ست کہ آزادِ عاشقاں   چنداں نمے کند کہ بہ بیداد خو کنند

معشوق جب بلند پایہ ہوتا ہے اور وہاں تک رسائی ناممکن ہوتی ہے تو عاشق اپنی پستی حالت کا اندازہ کرتا ہے اور اُس وقت یہ رنج کم ہوتا ہے کہ دیدار سے بہرہ ور نہیں ہو سکتا، عرفی اس حالت کو حسرت کے لہجہ میں دکھاتا ہے،

آہ ازاں حوصلۂ تنگ و ازاں حُسنِ بلند کہ دلم را گلہ از حسرتِ دیدار تو نیست
نہ باندازہ بازوست کمندم ہیہات ور نہ با گوشۂ بامیم سروکارے ہست

معشوق کی عام دلفریبی کو یوں ظاہر کرتا ہے،

یارب تو نگہ دار دلِ خلوتیاں را کان غنچہ مست ست و در صومعہ باز ست

ناز کی بے اعتنائی کا مضمون کس خوبی سے پیدا کیا ہے،

طغیانِ ناز بین کہ جگر گوشۂ خلیل در زیرِ تیغ رفت و شہیدش نمے کنند
یعنے حضرت اسمٰعیل

بیگانوں کے ساتھ معشوق کی صحبت بدمزہ ہے،

میروی باغیرو مے گوئی بیا عرفی تو ہم لطف فرمودی برو کین پائے رار فتار نیست

یعنی غیروں کے ساتھ جا رہے ہو اور کہتے ہو کہ عرفی تو بھی آ، آپ کی عنایت لیکن مجھ سے چلا نہیں جاتا،

عشق میں عقل اور سمجھ سے کام لینا نہیں چاہئے۔

گفتگوہائے حکیمانہ نیالاید عشق بگذارید کہ این نکتہ مُسلم باشد

حُسن کی رونق عشق سے ہے اور عشق کی حُسن سے،

این صفا عشق و محبت زہم اندوختہ اند این دو شمعے ست کہ از یکدگر افروختہ اند

تھوڑا سا غم، دل کی عالی ظرفی کے قابل نہیں اور زیادہ سما نہیں سکتا،

فریاد کہ غم ہائے تو در سینۂ تنگم اندک نبود لایق و بسیار نہ گنجد

اب ہم عرفی کے ہر قسم کے چند عشقیہ اشعار درج کرتے ہیں،

دہ، کہ از دوختن ایں چاک گریبان رفتہ است — ایں شگافے ست کہ تا دامن ایمان رفتہ است

رفت آں آفت جان از برم اے ہوش بیا — تا بہ بینم کہ چہا بر سر ایمان رفتہ است

یعنی وہ آفت جان چلا گیا، اے ہوش اب آ، تا کہ دیکھوں کہ ایمان پر کیا گذری،

عرفی از ہر دو جہان قسے مدالا در دوست — ہمہ جا وحشی از اں ست کہ رام ست اینجا

بحث در ردّ و قبول بُت ترسا بچہ ست — ورنہ از کفر زبونی نبود ایمان را

یعنی ایمان کفر سے کم رتبہ نہیں لیکن گفتگو یہ ہے کہ کافر بچہ اسکو قبول بھی کریگا یا نہیں

ز وصلش یافتم ذوقے کہ نبود انتقام آں را — کسے ہرگز چنیں داغے بدل ننہادہ ہجران را

یعنی اُس کے وصل میں میں نے وہ مزہ پایا کہ اس کا کچھ جواب نہیں ہو سکتا، کسی شخص نے ہجر کو اس طرح نہ جلایا ہو گا جس طرح میں نے جلایا ہے،

قبول خاطر معشوق، شرط دیدار ست — بحکم شوق تماشا مکن کہ بے ادبی ست

یعنی معشوق جس حد تک پسند کرے اُسی حد تک نظارہ کرنا چاہئے، اپنے شوق کے موافق نظارہ بازی کرنا بے ادبی میں داخل ہے،

عرفی، بہ حال نزع رسیدی و بر شدی — شرمت نیامد از دل امیدوار دوست

بہانہ جوی تو، عرفی! بناز عادت کرد — بآشتی مرو اکنوں کہ صلح ہم جنگ ست

ز شکوہ ہاے جفایت، دو کون پر شد لیک (اپنے معشوق) — ہنوز رنگ ادب بر رخ سخن باقی ست

یعنی باوجود انتہاے شکایت کے پاس ادب نہیں گیا

حسنش نیازمند تماشا ز ناز نیست — آما ز ذوق جلوۂ خود بے نیاز نیست

دو عالم سوختن نیرنگ عشق ست — شہادت ابتداے جنگ عشق ست

دماغ آشفتہ داریم دل نام — کہ سرتا پاے صلح وجنگ عشق ست

آں چناں مست جمال ست کہ شب تا بسحر — مے کشد جام وز کیفیت مے آگہ نیست

بروا ے عقل منہ منطق وحکمت در پیش — کہ مرا نسخۂ غمہاتے فلاں در پیش ست

ہاں رہ عشق ست کج رفتن ندارد باز گشت — جرم را اینجا عقوبت ہست استغفار نیست

تا فریبد ابلہاں را از متاع رفتے دست — آسمان پیش از تو یوسف را ببازار آورد

زبت نہ گوشۂ چشمے نہ چین ابروئے — بحیر تم کہ دل برہمن ز کف چوں شد

چو برد پیام، قاصد کنم ایں خیال دگریم — کہ برش حکایت من بکجا رسیدہ باشد

تا چند بزنجیر خرد بند تواں بود — بے مستی و آشوب جنوں چند تواں بود

اے اجل! جاں ندہند، اہل وفا سعی مکن — یا برو، رخصت ازاں غمزۂ خونخوار بیار

اے آنکہ نرفت ست عناں دلت از دست — یک لحظہ تماشائی آں دست وعناں باش

بشکنم ناقوس و تسبیحے بدست آرم ولی — چوں کنم باآں کہ زنار از میاں مے رویدم

میروی باغیر و مے گوئی بیا عرفی تو ہم — لطف فرمودی برو کیں پاے رار فتار نیست

بیا اے عشق! رسوائی جہانم کن کہ یک چندے — نصیحت ہاے بیدرداں شنیدن آرزو دارم

داغ برہم بس کہ پیوستم نشان از دل نماند — پیش ازیں صد داغ بر دل داشتم اکنوں یکے ست

عالمے در جلوۂ وعاشق نہ بیند غیر دوست — گر ز مجنوں پرسی اندر کارواں محمل یکے ست

(فلسفہ) عرفی نے غزل میں جس قدر فلسفیانہ خیالات ادا کئے کسی شاعر نے ادا نہیں کئے،

اس کے ساتھ یہ خصوصیت ہے کہ شاعرانہ طرز ادا ہاتھ سے نہیں جاتا، سحابی، ناصر خسرو وغیرہ نے بھی دقیق فلسفی مسایل بیان کئے ہیں، لیکن وہ محض فلسفہ ہے جو نظم میں ادا کر دیا

گیا ہے، شاعری نہیں، بخلاف اس کے عرفی اس انداز سے ان باتوں کو ادا کرتا ہے کہ اگر کوئی شخص فلسفہ کی حیثیت سے اُس سے لطف نہ اُٹھائے، تاہم شاعرانہ ذوق سے محروم نہ رہے گا مثالوں سے اس کا اندازہ ہو سکے گا،

یہ سب کہتے آئے ہیں کہ حقایق اشیاء ہم کو معلوم نہیں، سقراط نے کہا تھا کہ "مجھ کو صرف اسی قدر معلوم ہوا کہ کچھ معلوم نہیں ہوا" بعینہ اسی خیال کو، فارابی، ابن سینا وغیرہ نے اشعار میں ادا کیا، لیکن عرفی نے اس فلسفہ کا ایک قدم اور آگے بڑھا دیا، وہ کہتا ہے،

حدِّ کُنہِ تو بہ ادراک نشاید دانست ۔۔۔ وین سخن نیز باندازۂ ادراک من ست

خدا کی ذات اور صفات کی جو تفسیر تمام اہل مذاہب نے کی ہے خوب غور کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انسان نے اُنہیں حالات، اُنہیں اوصاف، اُنہیں اخلاق کو جو اُس نے انسانوں میں دیکھے ہیں، زیادہ وسیع، زیادہ پاک، زیادہ بلند فرض کرکے ایک ذات کا تصور باندھ لیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر قوم میں خدا کے اوصاف کی نسبت مختلف خیال ہیں، اس بنا پر عرفی کہتا ہے،

فقیہان دفترے رامے پرستند ۔۔۔ حرم جویان دری رامے پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد ۔۔۔ کہ یاراں دیگرے رامے پرستند

یعنی خدا اگر اپنے چہرے سے پردہ اُٹھا دے تو لوگوں کو نظر آئے گا کہ ہم خدا کو نہیں، بلکہ کسی اور چیز کو پوج رہے تھے، اسی مضمون کو ایک اور لطیف طریقہ سے ادا کیا ہے،

آناں کہ وصف حُسن تو تفسیر مے کنند ۔۔۔ خواب ندیدہ راہمہ تعبیر مے کنند

حقایق اشیاء یا عقاید مذہبی، کی نسبت یا تو انسان کو نہایت اعلیٰ درجہ کا فلسفی ہونا چاہئے کہ تمام راز اُس پر منکشف ہو گئے ہوں، یا محض تقلید پر عمل کرنا چاہئے، بیچ کی جو حالت

ہے یعنی نہ تقلید، نہ اجتہاد کامل، یہ نہایت خطرہ کی حالت ہے، اور افسوس ہے کہ تمام عالم اسی میں مبتلا ہے، **عرفی** کو تین سو برس پہلے یہ نکتہ معلوم ہو چکا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

قدم بروں منہ از جہل یا فلاطون شو — کہ گر میانہ گزینی سراب و تشنہ لبی ست

یعنی یا تو بالکل جاہل رہو یا فلاطون بنو، ورنہ بیچ میں رہو گے تو سراب اور تشنہ لب کا حال ہوگا،

عرفی اپنی وسیع المشربی سے عرفان اور ذوق کو اسلام یا کفر میں محدود نہیں سمجھتا اس کے نزدیک ہر جگہ حقیقت کا پرتو نظر آتا ہے اس خیال کو اوروں نے بھی ادا کیا تھا لیکن عرفی نے ایک عجیب تشبیہ سے اس کو صاف دکھا دیا،

عارف، ہم از اسلام خراب ست و ہم از کفر — پروانہ چراغ حرم و دیر نداند

یہ ظاہر ہے کہ پروانہ صرف چراغ ڈھونڈھتا ہے، وہ خواہ حرم میں جلتا ہو یا بُت خانہ میں، بُت شکنی پر لوگ ناز کرتے ہیں لیکن ایک عارف کو نظر آتا ہے کہ بُت شکنوں میں بھی وہی تمام اخلاق موجود ہیں، جو بُت پرستوں میں پائے جاتے ہیں، اس لئے ایسی بت شکنی سے کیا فائدہ اس بنا پر عرفی کہتا ہے،

رفتم بہ بت شکستن و ہنگام بازگشت — با برہمن گذاشتم از ننگ، دین خویش

یعنی بُت توڑنے تو گیا تھا، لیکن جب واپس چلا تو اپنا دین برہمن ہی کے یہاں چھوڑ آیا،

عام مسلمان جس طرح کعبہ کے ساتھ پیش آتے ہیں اُس میں اور بُت پرستی میں مشکل سے فرق کیا جا سکتا ہے اس بنا پر **فیضی** نے کہا تھا،

آں کہ مے کرد مرا منع پرستیدن بُت — درحرم رفت، طواف در و دیوار چہ کرد

عرفی اس مضمون کو زیادہ لطیف پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

ساکنِ کعبہ کجا دولتِ دیدار کجا　　　این قدر ہست کہ دِرسایۂ دیوارے ہست

عالم میں جو کچھ نظر آتا ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو سب راز ہے،

ہر کس نشناسندۂ راز ست، وگرنہ　　　این ہا ہمہ راز ست کہ مفہوم عوام ست

چو دل شناخت سرِ رشتہ، گشت معلومش　　　کہ دم بدم بکف آوردۂ ورہا کردست

انسان عالم اکبر ہے،

از کتابے کہ منش خاتمہ ام　　　لوح محفوظ نخستین ورق ست

سالک کو طلب چاہئے، تقاضا نہیں،

زبان بہ بند و نظر باز کن کہ منع کلیم　　　کنایت از ادب آموزی تقاضا ئیست

یعنی آنکھیں کھولو، اور زبان بند کرو کیونکہ کلیم کو جو منع کیا تھا تو یہ بتاتا تھا کہ ادب ملحوظ رکھنا چاہئے

حصول معرفت کیلئے وہم اور شکوک کی جولانیاں مفید نہیں، بلکہ سکون اور صبر درکار ہے،

چنداں کہ دست و پا زدم آشفتہ تر شدم　　　ساکن شدم میانۂ دریا کنار شد

تدبر اور غور کی ترغیب

خمیر مایۂ آسایش ست لاے شراب　　　بگو کہ صاف کشان جرعۂ زتہ گیرند
تلچھٹ

لوگ نیک و بد میں تمیز نہیں کرسکتے،

چہ ظلمت ست کہ بینندگان نمے دانند　　　کہ شب چراغ ستانند یا شبہہ گیرند

کسی قوم کی ترقی کے یہ معنے ہیں کہ دوسری قوم نے تنزل کیا ہے،

زمانہ گلشنِ عیشِ کرا؟ بہ یغما داد　　　کہ گل بدامنِ ما دستہ دستہ مے آید

چونکہ مذہب کا مقصد زیادہ تر جمہور عام کی ہدایت کرنا ہوتا ہے، اس لئے مذہبی دلائل اکثر فلسفیانہ نہیں ہوتے، بلکہ خطابیات اور عام فہم ہوتے ہیں، جن لوگوں کی فطرت

ہیں خدا نے مذہبی میلان رکھا ہے ان کو انہیں دلائل سے تشفی ہو جاتی ہے، لیکن جن کو مذہب کا درد نہیں اُن کو فوراً نظر آجاتا ہے کہ یہ دلائل قطعی نہیں، بلکہ عام پسند ہیں اس بنا پر ان لوگوں کو ناز ہوتا ہے کہ ہم کس قدر حقیقت شناس ہیں، **عرفی** کہتا ہے کہ یہ ناز کی بات نہیں بلکہ مذہبی بیدردی کی دلیل ہے، اس کو یوں ادا کرتا ہے،

زنقصِ تشنہ لبی دان، بعقل خویش مناز ۔۔۔ دلت فریب گر از جلوۂ سراب نہ خورد

سراب اُس ریتے کو کہتے ہیں جو دور سے پانی کی طرح نظر آتا ہے، شعر کا مطلب یہ ہے، کہ فرض کرو تمہارا گذر سراب پر ہوا، اور تم نے فوراً سمجھ لیا کہ یہ سراب ہے، پانی نہیں، تو تم اپنی عقل پر ناز نہ کرو، بلکہ یہ سمجھو کہ تم پیاسے نہ تھے، ورنہ اگر پیاس کا غلبہ ہوتا تو قطعاً سراب پانی نظر آتا، سراب کی تشبیہ شاعر نے علی سبیل التنزل دی ہے، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ مذہبی دلائل سراب نہیں ہوتے،

عام لوگ سمجھ نہیں رکھتے ورنہ عُرفا کنایوں میں سب کچھ کہہ جاتے ہیں،

مگو کہ نکتہ سرایانِ عشق خاموش اند ۔۔۔ کہ حرف نازک و اصحاب، پنبہ در گوش اند

کفر اور دین، دونوں اپنی گرم بازاری کے لئے لوگوں کو لڑواتے ہیں،

کفر و دین را ببر از یاد کہ ایں فتنہ گران ۔۔۔ در بدآموزی ما مصلحت اندیش ہم اند

تعلق، ہر قسم کا حجاب پیدا کرتا ہے،

گر تعلق نیست اسبابِ جہان مردود باش ۔۔۔ صد ہزاراں پردہ پیش پردۂ حائل یکیست

اخلاق | **عرفی** نے اخلاق کے اکثر مسائل بیان کئے ہیں، لیکن وہ صرف اُن اخلاقی اوصاف کو لیتا ہے جو عزت نفس اور علو حوصلہ سے تعلق رکھتے ہیں، یہاں تک کہ اگر یہ اوصاف غرور و نخوت کی حد تک بھی پہنچ جائیں تو اُس کے نزدیک اُن اوصاف سے بہتر ہیں جنکی سرحد

پست ہمتی سے مل جاتی ہے۔ مثلاً تواضع، انکسار، فروتنی، توکل، قناعت وغیرہ وغیرہ،
اس بنا پر کہتا ہے،

کفرانِ نعمتِ گلہ منداںِ بے ادب — در کیش من ناشکرِ گدایانہ بہتر ست

وہ اعمال نیک کی تعلیم دیتا ہے، لیکن اس لئے نہیں کہ دوزخ سے بچنے کا ذریعہ ہیں، بلکہ اس لئے کہ گناہ گار نادم ہوتا ہے، اور بسا اوقات ندامت نجات کا باعث ہو جاتی ہے اس لئے وہ مفت خواری کی نجات کو، عالی حوصلگی کے خلاف سمجھتا ہے،

بضاعتے بکف آور کہ ترسمت، فردا — بجوے فشانی پیشانی حیا بخشند

یعنی عمل کا سرمایہ جمع کرو، ایسا نہ ہو کہ تم کو قیامت میں اس لئے بخش دیں کہ تمہاری پیشانی سے ندامت کا پسینہ ٹپکا تھا،

اس سے زیادہ صاف اور واضح کہتا ہے،

گرفتم آں کہ بہشتم دہند بے طاعت — قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف ست

یعنی یہ مان لیا کہ مجھ کو بہشت بغیر عمل کے مل جائے گی، لیکن اس کو قبول کرنا انصاف کے خلاف ہے،

وہ عالی حوصلگی کا یہ نمونہ پیش کرتا ہے کہ مخالف اگو ہماری غلطی کو صحیح سمجھ لے، تاہم ہم کو مطمئن نہیں ہونا چاہئے،

رُستم ز مدعی بقبول غلط دلے — در تابم از شکنجۂ طبع سلیم خویش

وہ یہ سکھلاتا ہے کہ گفتگو اور مباحثہ کی معرکہ آرائیوں میں فتح حاصل کرو، لیکن اس طرح کہ فریق مقابل کا دل نہ دکھنے پائے،

زخمہا بر داشتیم و فتح ہا کردیم لیک — ہرگز از خون کسے رنگین نشد دامان ما

وہ تجرد، صحرانوردی، ترک لباس کو ریا کا شائبہ بتاتا ہے،

مرو بباد بہ گردی کہ زرق و شیدلے ست — برہنگی مطلب، کان لباس رعنائی ست

وہ سکھاتا ہے کہ اپنے آپ کو عز بزالوجود نہ سمجھو، دنیا کا کارخانہ تم پر بند نہیں،

گمان مبر کہ تو چوں بگذری جہان بگذشت — ہزار شمع بکشتند و انجمن باقی ست

وہ بتاتا ہے کہ اگر اپنا عیب دیکھنا چاہو تو اپنے آپ کو خود اپنا دشمن اور منافق دشمن بنا کر دیکھو،

خواہی کہ عیب ہاے تو روشن شود ترا — یک دم، منافقانہ نشین در کمین خویش

منافق اُس کو کہتے ہیں جس کے دل میں مخالفت ہو اور زبان سے دوستی کا اظہار کرتا ہو، شعر کا مطلب یہ ہے کہ اگر اپنے عیب سے واقف ہونا چاہتے ہو تو اُس کی ترکیب یہ ہے کہ اپنے آپ کو ایک الگ شخص فرض کرو اور اُس سے بظاہر دوستی کا اظہار کرو، چونکہ انسان اپنے دوست سے کسی بات کا پردہ نہیں رکھتا اس لئے وہ شخص اپنے تمام راز تمہارے سامنے کھول کر رکھ دے گا اس طرح تمام عیب ظاہر ہو جائیں گے،

وہ کہتا ہے کہ اگر ایک مسلمان کے روحانی اخلاق ایک کافر کے اخلاق سے بالاتر نہیں تو اُس کے اسلام کو کفر پر کوئی ترجیح نہیں،

رفتم بہ بت شکستن و ہنگام باز گشت — با برہمن گذاشتم از شرم دینِ خویش

اس نے نہایت عمدہ تشبیہ سے اس بات کو علانیہ دکھایا کہ جو لوگ خود آلودہ ہیں اُن کی نصیحت کچھ اثر نہیں کر سکتی،

وعظِ من گرد فشانندۂ عصیاں نشود — آستینِ شکر آلود مگس ران نشود

وہ کہتا ہے کہ ریاکاری اسقدر عام ہو گئی ہے کہ کھلے ڈلے رندوں پر بھی اعتماد نہیں رہا،

از صدق اہل بُت کدہ ہم اعتماد رفت　　　از بس کہ اہل صومعہ تزدیر مے کنند

زاہد اور برہمن، میں اس کے نزدیک جو فرق ہے یہ ہے،

کافر ترست زاہد از برہمن، ولیکن　　　او را بُت ست دَر سر، در آستین ندارد

یعنی زاہد برہمن سے بھی زیادہ کافر ہے، فرق یہ ہے کہ زاہد کے ہاتھ میں بت نہیں ہے بلکہ سَر میں ہے،

آزادی اور خود مختاری کا وہ اس قدر شیفتہ ہے کہ اگر کوئی شخص نام کو بھی آزاد ہو تو اُس کے نزدیک رشک کے قابل ہے،

حَسدِ تہمت آزادی سرو م بگداخت　　　کین مرادے ست کہ بر تہمتِ آں ہم حسدست

سرو کو شعرا، آزاد باندھتے ہیں، عرفی کہتا ہے کہ گویہ تہمت ہے لیکن میں اس پر بھی رشک کرتا ہوں، کیونکہ آزادی وہ نعمت ہے کہ جھوٹوں بھی کوئی شخص آزاد کہلائے تو رشک کے قابل ہے،

وہ سکھلاتا ہے کہ اصلی لذت اور آرام، روحانی لذت اور آرام ہے، اور یہ حاصل ہو تو ظاہری تکلیفات سے مطلقاً متاثر ہونا نہیں چاہئے،

معشوق در میانہ جان مدعی کجاست　　　گل از دماغ مے دمد آسیب خار چیست

وہ ہر بات میں میانہ روی اور اعتدال کی تعلیم دیتا ہے، اور اس مضمون کو اس لطیف پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

را دو خضر عنان گیر باید از چپ و راست　　　کہ کج روی نہ کنم ورنہ عزم راہ خطاست

امامِ شہر ز سر جوشِ خم نہ پرہیزد　　　نزاع بر سرِ تہ شیشہ ہائے ناصاف ست

یعنی مال حرام، اگر بھرپور ملے تو امام شہر کو دریغ نہ ہو، یہ جو انکار ہے اس لحاظ سے

ہے کہ اُس کی مقدار تھوڑی ہے،

علو نفس، بلند ہمتی، اور حوصلہ مندی کے خیالات، جو عموماً شاعری میں نہایت کم تھے، عرفی نے کثرت سے ادا کئے، چونکہ خود نہایت غیور اور عالی حوصلہ تھا، اس لئے وہ عادات اور اخلاق جو بظاہر علو نفس کے خلاف نہ تھے، لیکن در اصل ان کی بنیاد دنارت پر تھی، اُن کی تہ تک اُس کی نگاہ پہنچتی تھی، مثلاً تمام ایشیا میں حاتم کی فیاضی اور سخاوت کے چرچے پھیلے ہوئے ہیں، اور تمام لوگ اُس کی فیاضی کے افسانوں کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں، یہ امر بظاہر کوئی بُری بات نہیں بلکہ سچی قدردانی کی دلیل ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ چونکہ ایشیا میں اکثر مُفت خواری کا طریقہ جاری رہا، یعنے لوگ سلاطین اور امراسے مفت کے صلے اور انعامات حاصل کرتے تھے، اس لئے اس قسم کی فیاضیوں کی نہایت مدح سرائی کرتے تھے، عرفی نے دیکھا کہ اس قدردانی کی تہ میں اس مُفت خواری کا اثر ہے اس لئے کہتا ہے،

بیا بہ ملک قناعت کہ دردسر نہ کشی　　　ز قصہ ہا کہ بہمت فروش طے بستند

(حاتم طائی)

یعنی اگر قناعت اختیار کر لو تو تم کو ان کہانیوں میں کچھ مزہ نہ آئے گا جو حاتم طائی کیطرف منسوب ہیں،

اس سے زیادہ صاف کہتا ہے،

کفران نعمتِ گلہ مندان بے ادب　　　در کیش من ز شکر گدایانہ بہتر ست

یعنی میں کفران نعمت کو بھی گدایانہ شکر گزاری سے زیادہ پسند کرتا ہوں،

زمانہ کے ہاتھ سے مجبور ہو کر معمولی چیز کی خواہش کرتا ہے، اس پر خود اسکو افسوس آتا ہے اور کہتا ہے،

کشادم دام بر کنجشک اوشادم یاد آں ہمت — کہ گر سیمرغ مے آمد بدام آزاد مے کردم

یعنے اب تو میں کنجشک پر جال ڈالتا ہوں اور اسی پر راضی ہوں، لیکن ایک وہ بھی وقت تھا کہ سیمرغ جال میں پھنسا ہے اور میں نے چھوڑ دیا ہے،

بساطے کا نارد طرح دو عالم مے توان کردن — بدست آوردہ ام اندازۂ و پرکار مے باید

گرفتم آں کہ بہشتم دہند بے طاعت — قبول کردن و رفتن نہ شرط انصاف ست

وقتِ عرفی خوش کہ نکشودند اگر در بر رخش — بر درِ نکشودہ ساکن شد درِ دیگر نہ زد

عاشقانہ جذبات اور خیالات میں بھی اس کی عالی حوصلگی نہیں جاتی،

من ازیں درد گرانبار چہ لذت یابم — کہ باندازۂ آں صبر و ثباتم دادند

یعنی اس غم سے مجھ کو کیا لذت ملسکتی ہے جبکہ اسکی برابر مجھ کو صبر اور استقلال بھی عنایت ہوا ہے

تذکرۂ سرخوش میں لکھا ہے کہ "ناصر علی اس شعر کو زیادہ پسند کرتا تھا" اگر یہ صحیح ہے تو ناصر علی کی اس بدمذاقی کا کفارہ ہو گیا جو اُس نے نظامی اور ظہوری کے موازنہ میں ظاہر کی تھی،

بادہ خواہی باش تا از خونِ دل بیروں دہم — ایں کہ در جام و سبو دارم مہیا آتش ست

ہم سمندر[۱] باش و ہم ماہی کہ در جیحونِ عشق — روے دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش ست

عشق اگر مرد ست مردے تاب دیدار آورد — ورنہ چوں موسیٰ بسے آورد لبسیار آورد

مدہ عنان تعلق بحسن ہر ذرہ — بر آردستے و بر دوش آفتاب انداز

نہ بزم آسمان و یکے ذرہ در سماع — واں ہم بکامِ دل نفشاند آستینِ خویش

یعنی آسمان کی نو مجلسوں میں ایک ذرہ (انسان)، وجد کر رہا تھا، لیکن ان مجلسوں کی مجموعی فضا میں بھی وسعت نہ تھی کہ وہ ذرہ ہاتھ پھیلا کر ناچ سکتا،

[۱] عوام کے اعتقاد میں ایک کیڑا ہے جو آگ میں پیدا ہوتا ہے اور آگ ہی میں زندہ رہتا ہے،

نظیری نیشاپوری

محمد حسین نام، نظیری تخلص، اور نیشاپور وطن تھا، شاعری کا ابتدا سے شوق تھا اور ابتداے مشق ہی سے شہرت ہوچلی تھی، خراسان میں جب اس کی شاعری مسلم ہوچکی تو کاشان میں آیا، یہاں حاتم، فہمی، مقصود خردہ، شجاع، رضائی، شاعری میں استاد تسلیم کئے جاتے تھے، اُن کے مشاعروں میں جو طرحیں ہوتی تھیں، نظیری بھی اُن میں طبع آزمائی کرتا تھا اسی زمانہ میں ایک قدیم غزل طرح ہوئی، جاے تو باشد، ایماے تو باشد، نظیری نے غزل لکھی،

فلک مزدور ایماے تو باشد — نوا زو ہر کرا راے تو باشد

"جاے"، کا قافیہ اُستادوں کی غزل میں اس پہلو سے بندھ چکا تھا کہ اسکا جواب نہیں ہوسکتا تھا، مثلاً

دو عالم را بیک بار از دلِ تنگ — برون کردیم تا جاے تو باشد

نظیری نے اس پامال قافیہ کو بالکل نئے پہلو سے باندھا[۱]،

نیازارم زخود ہرگز دلے را — کہ مے ترسم درو جاے تو باشد

اسی قافیہ میں ایک اور اُستاد کا شعر یاد آیا،

جہانے مختصر خواہم کہ دروے — ہمیں جاے من وجاے تو باشد

اس زمانہ میں عبدالرحیم خانخانان کی فیاضیوں کا شہرہ دور دور پھیل چکا تھا، نظیری

---

[۱] شعراے مذکور کا مشاعرہ اور غزل کا یہ شعر مآثر رحیمی میں نقل کیا ہے،

نے اس کے دربار کا قصد کیا، اور آگرہ میں خانخاناں سے ملا، چنانچہ جو قصیدہ اس موقع پر لکھا اور جو دیوان میں موجود ہے، اُس کا عنوان یہ لکھا ہے،

این قصیدہ در مدح صاحب جیم ابو الفتح بہادر عبد الرحیم خانخانان بن بیرم خاں ہنگامیکہ بایلغار از گجرات بدار السلطنت آگرہ آمدہ بودند داول مداحی وملازمت این جا کردہ بود گفتہ شد،

غالباً یہ سنہ ۹۹۲ ہجری ہوگا کیونکہ اسی سنہ میں خانخاناں گجرات سے آگرہ گیا ہے، اور مظفر گجراتی کے شکست دینے کے صلہ میں، اس کو خانخانان کا خطاب ملا ہے،

غالباً خانخانان ہی کی تقریب کرنے سے اکبر کے دربار تک رسائی ہوئی، اوّل اوّل جب وہ دربار میں پہنچا ہے تو جہانگیر کے بیٹے پیدا ہونے کا جشن تھا، نظیری نے جو قصیدہ اس موقع پر پیش کیا ہے، اس کے عنوان میں صرف اسی قدر لکھا ہے نام کی تصریح نہیں کی، قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ خسرو کی ولادت کا جشن ہوگا جو سنہ ۹۹۶ ہجری میں پیدا ہوا تھا، اس قصیدہ سے ثابت ہوتا ہے کہ نظیری کے بہت سے حاسد پیدا ہوگئے تھے جو اُس کی رسائی میں خلل انداز ہوتے تھے چنانچہ خاتمہ میں کہتا ہے،

جماعتے زسفیہانِ تیرہ طبع دنی — مدام درپیش افتادہ اند ہمچو وبال
زبے تمیزی این ناقدان کم مایہ — گہر بقدر خزف گشتہ زر بسرخ سفال
سزد کہ اخترِ نظم مرا بیک ساعت — توجہ تو برون آرد از ہبوط و وبال

اکبر کی مدح میں اس نے وقتاً فوقتاً اور بھی قصیدے لکھے، اور غالباً مقبول بھی ہوئے لیکن دربار میں اس کو کوئی خاص امتیاز نہیں حاصل ہوا، اس لئے اس نے اپنا مستقل تعلق خانخاناں کے دربار سے قائم رکھا اور احمد آباد گجرات میں سکونت اختیار کی، چند برس کے

بعد حج کا ارادہ کیا اور اس تقریب میں ایک قصیدہ لکھ کر خانخانان کی خدمت میں پیش کیا جس کا مطلع یہ ہے،

زہنر بنجود تنگنجم چو بخُم مے مُغانی   بدرز لباس بر تن چو بجو شدم معانی

اس میں شاعرانہ طریقہ سے مصارف سفر کی درخواست کی،

ہمہ عیش ایں جہانی بعنایت تو دیدم   چہ عجب اگر بیابم زتو زاد آنجہانی

خانخانان نے سفر کا سامان کر دیا، چنانچہ سورت سے جہاز پر سوار ہو کر مکہ معظمہ کو[1] روانہ ہوا، راستہ میں بدّوں نے لوٹ لیا، تاہم اس نے حج اور زیارت دونوں حاصل کی،

مآثر رحیمی میں نظیری کا سفر ۱۰۱۲ھ ہجری میں لکھا ہے، لیکن یہ سخت تعجب کی بات ہے، نظیری کے دیوان میں ایک قصیدہ سلطان مراد (ابن اکبر شاہ) کی مدح میں ہے، اسکے عنوان میں خود نظیری لکھتا ہے،

ایں قصیدہ نیز بعد از معاودت مکہ معظمہ بہ احمد آباد گجرات در مدح شاہزادہ ہمایون نژاد شاہ مراد گفتہ شد،

یہ مسلم ہے کہ مراد ۱۰۰۸ھ ہجری میں مرا ہے اس لئے نظیری کا سفر حج ۱۰۱۲ھ میں محال ہے، زیادہ تعجب اس وجہ سے ہوتا ہے کہ مآثر رحیمی کا مصنف نظیری کا ہمعصر اور اُس کا خواجہ تاش ہے قیاس یہ ہے کہ نظیری نے ۱۰۰۲ھ میں حج کیا ہے، علاوہ اور قرائن کے ایک قرینہ یہ ہے کہ خان اعظم میرزا کوکہ (اکبر کا رضاعی بھائی) نے اسی سال میں حج کا سفر کیا تھا، اور نظیری کے دیوان میں ایک قصیدہ خان اعظم کی مدح میں ہے جس کا عنوان یہ ہے،

ایں قصیدہ در راہ مکہ مکرمہ بعد از غارت سارقان وحرامیان مُذیل بمدح نواب

[1] مآثر رحیمی،

محمد عزیز اعظم خان منظوم شد،

اس قصیدہ میں اپنی حالت بیان کر کے درخواست کی ہے کہ میری زاد راہ کا سامان کردیا جائے،

به گوشۂ نظر التفات، محتاجم | بزاری کہ توان گشتنم بہ نیم نگاہ
زبے بضاعتی خود چنان ہراسانم | کہ بہر توشۂ رہ باز گردم از ارگاہ
بسیل مرحمت از خاکِ ذلتم بردار | کہ ہمچو غلبۂ عطشان فتادہ ام بہ راہ

حج سے واپس آکر اس نے مراد کے دربار میں رسائی حاصل کی، اکبر نے شہزادہ مراد کو دکن کی مہم پر بھیجا تھا، وہ اِن اطراف میں فوجیں لئے ہوئے پڑا تھا نظیری چلتا پھرتا اس طرف جانکلا، دربار میں جانا چاہتا تھا کہ راہ میں ایک قدردان سخن کی نظر پڑ گئی اُس نے بڑھ کر کہا کہ خوب موقع پر آئے، نوروز کا جشن ہے، قصیدہ لکھ کر پیش کیجئے، خود جا کر شاہزادہ سے تقریب کی، چوبدار آکر لوا گیا، دربار میں سجدہ بجالانے کا دستور تھا، لیکن دربار کی شان وشوکت دیکھ کر نظیری کے حواس جاتے رہے، اس لئے آداب اور آئین سب بھول گیا نقیبوں نے باز پرس کی تو جواب دیا کہ میں نے آج تک یہ شان وشوکت نہیں دیکھی تھی، اس لئے حواس ٹھکانے نہ رہے، یہ تمام واقعات، نظیری نے خود قصیدۂ مدحیہ میں لکھے ہیں موقع کے خاص خاص اشعار ہم نقل کرتے ہیں،

دران بساط کہ برخود مرا شعور نبود | ز دور، دیدۂ دانا دلے بمن افتاد
بمن گفت کہ اے زیب بخش مجمع اُنس | "بیا بیا کہ بوقت آمدی مبارک باد"
بساط مجلس و آئین جشن فرو دی ست | تو نیز جلوۂ آئین نظم خواہی داد
ہمیں دوید و بگفت و ہنوز پیدا بود | کہ شد غریو کزین قطرہ کرد دریا باد

چنان بپایۂ دولت شدم شتاب زدہ | کہ چند بار سرم در مقام پا افتاد
زبس کہ تیز برآں بارگاہ در رفتم | ادب ز پایۂ خود پاے برفراز نہاد
ز دلفریبی آئین و فرِ سلطانی | بگاہ تہنیتم رسم سجدہ رفت از یاد
چو خوب رسم ادب را بجا نیاوردم | ندا رسید کہ اے روستاے مادرزاد
بساط عرش و تکبر اتراچہ پیش آمد | حریم کعبہ و غفلت اتراچہ حال افتاد
جواب دادم و گفتم بجرم معذورم | کہ تامنم بچنیں دولتے نگشتم شاد

۱۰۱۴ھ ہجری میں اکبر نے وفات پائی اور جہانگیر تخت پر بیٹھا، وہ نہایت سخن شناس اور صاحب ذوق تھا، نظیری کا شہرہ سُن کر دربار میں طلب کیا، چنانچہ ۵ھ تخت نشینی مطابق ۱۰۱۹ھ ہجری میں نظیری، دربار میں حاضر ہوا اور انوری کے قصیدہ پر قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جہانگیر خود تزک میں اس واقعہ کو لکھتا ہے،

نظیری نیشاپوری کہ در فن شعر و شاعری از مردم قرار دادہ بود و در گجرات بعنوان تجارت بسر مے برد قبل ازیں طلبیدہ بودم دریں ولا آمدہ ملازمت کرد قصیدۂ انوری راکہ

ع، باز ایں چہ جوانی و جمال ست جہان را،

تتبع نمودہ قصیدہ بجہت من گفتہ بود گذرانید، ہزار روپیہ و اسپ خلعت بصلہ ایں قصیدہ بدو مرحمت نمودم،

نظیری نے قصیدہ میں دربار کی رسائی کی پوری تفصیل لکھی ہے،

ناگاہ درآمد ز درم بانگ کہ گویند | فرمانِ طلب آمدہ از شاہ فلاں را
بے کفش و عمامہ بدر از خانہ دویدم | نے کردہ قبا در بر و نے بستہ میان را

تا حاکم دیوان و بلد بُرد رسولم　　دیدم ہمہ جا مژدہ دہان مژدہ رسان را
اصحاب، چسان مصحف از اصحاب ستانند　　بگرفتم از احباب بہ تعظیم، نشان را

یعنی جس طرح لوگ قرآن تعظیم سے لیتے ہیں، اسی طرح میں نے بادشاہ کا خط تعظیم سے ہاتھوں میں لیا

بوسیدم و بر فرق بہ تسلیم نہادم　　بکشادم و بر ناصیہ سودم رخ آں را
مے دیدم و مے سودم ازاں سرمہ نظر را　　برخواندم و لیسیدم ازاں شہد زباں را
فی الحال دویدم زپے مرکب و سامان　　کردم زہمہ روئے وداع اہل مکاں را
امروز سہ ماہ است کہ پویان سراغم　　گلشن بہ دماغ و بہ بغل حاصل کاں را
چوں بحر تو در جزر و مد شیر شکاری　　چوں گنج رواں من بطلب گنج رواں را

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے فرمان طلبی کے بعد تین مہینے نظیری کو دوڑ دھوپ میں گذرے، جس کی وجہ یہ تھی کہ جہانگیر شکار میں مصروف تھا،

یہ وہ زمانہ ہے جب **نظیری** تارک الدنیا ہو چکا تھا، لیکن غلامی اور طماعی کی جو عادت راسخ ہو چکی تھی اس کا اقتضا یہ تھا کہ تین مہینے تک خاک چھانتا پھرا، اور شاہی فرمان کو قرآن سے تشبیہ دی،

جہانگیر نے ایک دفعہ اس سے ایک عمارت کے کتابہ کی فرمایش کی، اُس نے یہ غزل لکھ کر پیش کی،

اے خاک درت صندل سرگشتہ سران را　　بادا مژہ، جاروب رہت، تاجوران را

جہانگیر نے اس کے صلہ میں تین ہزار بیگہ زمین انعام میں دی،[1]

گلزار ابرار[2] میں لکھا ہے کہ نظیری نے مرنے سے بارہ برس پہلے ترک دنیا کر کے گوشہ عزلت

---

[1] سرو آزاد، اور ید بیضا، [2] نسخہ موجودہ کتب خانہ ایشیاٹک سوسائٹی،

اختیار کیا، نظیری ۱۰۲۱ سنہ ہجری میں مرا ہے، اس لئے ۱۰۰۸ سنہ ہجری میں وہ گوشہ نشین ہوا ہے، دو تین قصیدوں کے شان نزول میں اس نے خود بھی اس واقعہ کا ذکر کیا ہے، لیکن امرا کی مداحی اس حالت میں بھی جاری تھی، چنانچہ یہ قصیدہ بھی اسی زمانہ کا ہے،

چندے بہ غلط بتکدہ کردیم حرم را ۔۔۔ وقت ست کہ از کعبہ بر آریم صنم را

اخیر میں اس کو علوم دینیہ کی تحصیل کا شوق ہوا، ۱۰۰۰ سنہ ہجری میں جب وہ خانخانان کی ہمرکابی میں دکن گیا ہے، تو راہ میں مندو سے گذرا، یہاں شیخ غوثی مندوی سے ملاقات ہوئی، انیسی، شریف کاشی، کافی سبزواری، ملا بقائی وغیرہ بھی اس سفر میں ساتھ تھے، نظیری کو جب دینیات کا شوق ہوا، تو انہیں شیخ غوثی سے پہلے عربیت کی تحصیل کی، پھر مولانا حسین جوہری سے تفسیر اور حدیث پڑھی،[1]

۱۰۲۰ سنہ ہجری میں گجرات سے آگرہ میں آیا اور خانخانان کو اپنا دیوان حوالہ کر کے پھر گجرات واپس گیا،[2]

۱۰۲۳ سنہ ہجری میں بمقام احمد آباد گجرات وفات پائی، مکان کے قریب ایک مسجد بنوائی تھی، اسی میں دفن ہوا، یہ مآثر رحیمی کی روایت ہے ورنہ اور تمام تذکروں میں سال وفات ۱۰۲۰ سنہ ہجری یا ۱۰۲۱ سنہ ہجری لکھا ہے،

نظیری کی قبر جس محلہ میں ہے اس کا نام تاجپورہ ہے، قبر پر ایک گنبد بھی ہے،

عام حالات اور اخلاق وعادات

نظیری نے اگرچہ بہت سے درباروں کی آستان بوسی کی لیکن اس کا اصلی تعلق خانخانان کے دربار سے تھا، خانخانان کو خان اعظم کوکہ (اکبر کا رضاعی بھائی) کی بہن بیاہی تھی، اس تعلق سے خان اعظم کی مداحی بھی کی ہے، اور باقی اکبر اور جہانگیر اور مراد تو حکمران وقت تھے، ان کی مداحی نہ کرتا تو کیا کرتا، معلوم ہوتا ہے کہ

[1] گلزار ابرار و خزانۂ عامرہ تذکرۂ شکیبی، [2] مآثر رحیمی،

شہزادہ مراد سے محبت

شہزادہ مراد سے اس کو دلی محبت تھی، شہزادہ موصوف کا جو مرثیہ لکھا ہے، اُس میں دلی جذبات نظر آتے ہیں،

اے بزم تیرہ، رخ چوں ارغوان کجاست	وے رزم! درہمی، شہ گیتی ستان کجاست
شوق سجود و حُرمتِ تعظیم کمتر ست	آں نازِ صدر و سرکشیِ آستان کجاست
برگ و شگوفہ ریخت ثمر از کجا خورم	بشکست شاخ برگ مرا آشیان کجاست
کس را سرو درخورِ ایں تعزیت نبود	پیدا کنید کاوّل ایں داستان کجاست
خلقے بہ شیون اند، و نگویند حال چیست	صبر سخن شنیدن و تاب بیان کجاست

آفاق در مصیبت او ممتحن شدہ
ایں مرگ باعث الم مرد و زن شدہ

غم خاست، در پیالہ مے از ساغر افگنید	شد بزم تیرہ، پردہ ازاں رخ بر افگنید
شمعے کہ دبر روشن از و بود، مردہ است	پروانہ را بر و بجا کستر افگنید
در بزم او ز حلقۂ ماتم، خرام نیست	ایں حلقہ را ز صحن سرا بر در افگنید
ریحانِ جلوہ، یاسمن عشوہ، ریختہ	چینید و ہم بران قدِ جان پرور افگنید
رفت آں سرے کہ تاج باو سرفراز بود	بر سر کنید خاک و کلاہ از سر افگنید

خیزید تا بہ آں سر تابوت دم زنیم
عرضی کنیم و کار و داعش بہم زنیم

خانخانان کے دربار میں جس قدر شعرا تھے، یعنی عرفی، شکیبی، انیسی وغیرہ سب سے معر کے رہتے تھے، ایک دفعہ خانخانان نے انیسی کو ایک خط لکھا جس کے حاشیہ پر نظیری کو بھی سلام لکھا تھا: **نظیری** کو نہایت ناگوار ہوا، ایک قصیدہ لکھا جسمیں شکایت

کا اس طرح اظہار کیا[1]

مُدّتے دو سہ مخصوصِ دلِ ما نکشیدے — مخدوم چنین یاد نہ کرد ست خادم را

ما نامِ خود از حاشیہ شستیم کزیں بیش — مہمانِ طفیلی نتوان بود قلم را

لاکھ روپیہ کا انعام

ایک دفعہ نظیری نے خانخاناں سے کہا کہ لاکھ روپے کا ڈھیر لگایا جائے تو کس قدر ہوگا؟ میں نے کبھی نہیں دیکھا، خانخاناں نے لاکھ روپے منگوا کر سامنے رکھوا دیئے، نظیری نے کہا خدا کا شکر ہے آپ کی بدولت میں نے لاکھ روپے تو دیکھ لئے، خانخاناں نے روپے اُس کے گھر بھجوا دیئے،

تجارت وصنعت

نظیری کو زرگری میں کمال تھا، اس کے ساتھ تجارت بھی کرتا تھا، شاعری کی فتوحات الگ تھی، اس بنا پر امیرانہ زندگی بسر کرتا تھا، اور اُمرا میں اس کا شمار ہوتا تھا[2] لیکن مزاج میں عرفی کی آن بان نہ تھی، اس لئے مرتے مرتے بھی مداحی کا شغل نہ چھوٹا،

مذہبی تعلیم

بخلاف اور شعرا کے مذہب میں سخت تھا، اکبر کے دربار میں جن آزادانہ خیالات کے چرچے رہتے تھے، اُن سے بہت جلتا تھا، شاہزادۂ مراد کی مدح میں جو قصیدہ لکھا ہے اُس کا خاص ذکر کیا ہے، اور ابو الفضل یا مبارک کا نام بھی کنایۃً لیا ہے،

طبیعتِ ہمہ ابنائے دہر ملحد شد — ولے زفطنتِ تو برطرف فتاد الحاد

گرچہ فضلۂ از فاضلان حاصلِ دہر — بہ طمع جاہ وغنا کرد، مذہبے ایجاد

پس از حصولِ مرادات، حالِ آں فاسد — مَثَل چو باغ گشت وحسرت شداد

سفرِ حج جس ذوق شوق سے کیا ہے اس سے بھی اس کے مذہبی جوش کا اندازہ ہوتا ہے

---

[1] مآثر رحیمی،

[2] مآثر الامرا تذکرۂ خانخاناں وخزانۂ عامرہ،

جہانگیر اور شاہ عباس صفوی دونوں نے تنباکو کے استعمال کو منع کرا دیا تھا[1] لیکن ع

چھٹتی نہیں ہے مُنہ سے یہ کافر لگی ہوئی — لوگ باز نہیں آتے تھے، نظیری بھی

اس کا جان دادہ تھا، چنانچہ تنباکو کی تعریف میں ایک غزل لکھی جو دیوان میں موجود ہے،

تنباکو کی تعریف

نے سنبل تنباکوے نہ آتش رخسارۂ — دل بوے خامے مے دہد بے داغ آتش پارۂ

در نخل تنباکو نگر صوفی شدہ باز آمدہ — در کوے خود سر گشتۂ در شہر خود آوارۂ

چوں بید مجنوں ہر طرف افگندہ از سر طرۂ — چوں دلق سالک ہر کجا افگندہ از بر پارۂ

پوری غزل تنباکو کی تعریف میں ہے،

اس زمانہ میں نظیر نام ایک شاعر تھا، نظیری نے اُس کو لکھا کہ اپنا تخلص بدل دو تاکہ دونوں تخلصوں میں اشتباہ نہ ہو، چونکہ نظیری در اصل نظیر سے ماخوذ ہے صرف ایک حرف زائد ہے اس لئے سرقہ کا الزام نظیری ہی پر عائد ہو سکتا تھا، نظیری نے دس ہزار روپے دیکر یہ حرف زائد ی، خریدا، اور نظیر نے اپنا تخلص بدل دیا[2]

شعرا میں سے خاص جن لوگوں سے نظیری کے معرکے رہتے تھے، عرفی، ظہوری، اور ملک قمی تھے عرفی نے تو نظیری کو قابل خطاب نہیں سمجھا، لیکن نظیری نے اُس کے مرے پیچھے قصیدہ میں اس کو گالیاں سُنائیں، چنانچہ عرفی کے حال میں ہم نے وہ اشعار نقل کر دیئے ہیں، ظہوری اور قمی نے ۱۰۲۰ھ ہجری میں نظیری کے پاس اپنے دیوان بھیجے، اور نظیری نے ایک ایک غزل کا جواب لکھا یہ اوحدی کا بیان ہے (ماخوذ از عرفات)، لیکن اس میں کسی قدر مبالغہ معلوم ہوتا ہے، نظیری اس زمانہ کے دو ہی ایک سال کے بعد مرا ہے، اس لئے اتنے کم زمانہ میں ظہوری اور قمی کی ہزاروں غزلوں کا جواب کیونکر لکھ سکتا تھا،

[1] مآثر رحیمی، [2] سرو آزاد اور ید بیضا،

نظیری کی خصوصیات

۱۔ تمدن جب ترقی کرتا ہے تو ہر چیز میں نئے نئے تکلفات پیدا ہوتے ہیں، اور اُن کے لئے جدت پسند صناع نئے نئے سامان پیدا کرتے ہیں، یہ اثر جس طرح مادی چیزوں پر عمل کرتا ہے، غیر مادی اشیا یعنی (خیالات) جذبات، محبت، راز و نیاز، سوز و گداز سب چیزوں پر عمل کرتا ہے، مثلاً ابتدائے تمدن میں معشوق کے صرف رنگ روپ، اور مناسب اعضا کا خیال آیا، اور اُس کے لئے حُسن ایک عام لفظ ایجاد کیا گیا، لیکن جب رنگین طبعی اور نکتہ سنجی زیادہ بڑھی تو معشوق کی ایک ایک ادا الگ الگ نظر آئی اور وسعت زبان نے ان کے مقابلہ میں نئے نئے الفاظ مثلاً کرشمہ، غمزہ، ناز، ادا وغیرہ وغیرہ تراشے، اس قسم کے الفاظ اور ترکیبیں جدت پسند طبیعتیں ایجاد کرتی ہیں، اور یہی طبیعتیں ہیں جن کو اس شریعت کا پیغمبر کہنا چاہئے، ان الفاظ کی بدولت آیندہ نسلوں کو سینکڑوں، ہزاروں خیالات اور جذبات کے ادا کرنے کا سامان ہاتھ آجاتا ہے **نظیری** اس شریعت کا اولوالعزم پیغمبر ہے اُس نے سینکڑوں نئے الفاظ اور سینکڑوں نئی ترکیبیں ایجاد کیں، یہ الفاظ پہلے سے موجود تھے، لیکن جس موقع پر اُس نے کام لیا، یا جس انداز سے اُن کو برتا، شاید پہلے اسطرح برتے نہیں گئے تھے، مثلاً

از کف نے دہد دل آسان ربودہ را   دیدیم زور بازوے نا آزمودہ را

آسان ربودہ کی ترکیب نئی ہے اور اس سے ایک وسیع خیال ادا ہو گیا، دوسرے مصرع میں زور، بازو، نا آزمودہ، سب مستعمل الفاظ ہیں، لیکن ان سے نئی طرح سے کام لیا ہے کہنا یہ تھا کہ معشوق کم سن ہے اور اس کو کسی طرح کا تجربہ نہیں تاہم جس شخص کا دل ایک دفعہ اُس پر آجاتا ہے پھر اُس کے پنجہ سے چھوٹ نہیں سکتا، اس مضمون کو یوں ادا کرتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ ایک نا آزمودہ بازو میں کس قدر زور ہے،

تا منفعل ز رنجش بیجا نہ سازمش — مے آرم اعتراف، گناہ نہ بودہ را

چہ خوش ست از دو یک دل سر حرف باز کردن — سخنِ گذشتہ گفتن گلہ دراز کردن

اثرِ عتاب بردن، ز دلِ ہم اندک اندک — بہ بدیہہ آفریدن بہ بہانہ ساز کردن

شعر کا مطلب یہ ہے کہ وہ بھی لطف کا کیا موقع ہوتا ہے جب دو یک دل دوست آپس میں مل بیٹھتے ہیں، گفتگو چھیڑتے ہیں، پرانے تذکرے کرتے ہیں، شکایتیں شروع ہوتی ہیں ایک دوست روٹھا ہوا ہے، دوسرا اس کو اس طرح آہستہ آہستہ مناتا جاتا ہے کہ جب وہ کوئی شکایت پیش کرتا ہے تو یہ جھٹ کوئی تاویل گڑھ لیتا ہے، فوری تاویل کرنے کے لئے "بدیہہ آفریدن"، کس قدر موزون لفظ ہے جو ایک بڑے خیال کو کس قدر مختصر لفظ میں ادا کر دیتا ہے، ز دل ہم، اور اندک اندک کی ترکیب کس قدر واقعہ کی تصویر کھینچ دیتی ہے،

نیست لذت ز نظر بازی بزمے کہ درو — خندۂ زیر لب و گریۂ پنہانے نیست

یہ اُس حالت کی تصویر ہے کہ معشوق، زیب مجلس ہے، ہر طرح کے لوگ جمع ہیں، انہیں میں عاشق غمزدہ بھی ہے، وہ لوگوں کی آنکھ بچا کر روتا ہے، معشوق دیکھ رہا ہے اور مُسکراتا ہے اس خیال کے ادا کرنے کے لئے، خندۂ زیر لب اور گریۂ پنہان کس قدر موزون ہیں،

چنان وقت شکایت از نگاہش مضطرب گشتم — کہ مضمونِ سخن صد بار از دل تا زبان گم شد،

کہنا یہ تھا کہ میں معشوق سے شکایت کر رہا تھا، دفعتہً اُس نے میری طرف نگاہ غضب سے دیکھا جس کی وجہ سے میرا یہ حال ہوا کہ سو سو دفعہ دل سے بات نکلتی تھی لیکن ہونٹوں تک آ آ کے رہ جاتی تھی،

شرم از میان برخاستہ، مُہر از دہان برداشتہ — گفتار ہے ترسش بہ بین، رفتار بے باکش نگر

شمارے تا سحر وستم بزلف درہمے دارد — گریبانم گریبان ست و دامن دامن ست امشب

شمار داشتن، یعنی مصروف بودن، مطلب یہ ہے کہ آج میرا ہاتھ زلف پریشان میں مصروف رہا، یعنی میں اُس کو سُلجھاتا رہا، اور میں اپنے گریبان اور دامن کو نہ پھاڑ سکا، اس لئے آج میرا گریبان گریبان ہے اور دامن دامن ہے، یعنی دونوں اصلی حالت پر ہیں، گریبان اور دامن کے سلامت رہ جانے کو صرف ان دو لفظوں کے مکرر لانے سے ادا کر دیا ہے، اور کس قدر خوشنما طرز ادا ہے،

۲- وہ اکثر وجدانی باتوں کو ایسے طریقہ سے ادا کرتا ہے کہ مجسم بن کر سامنے آجاتی ہیں اور اس سے عجیب خاص لطف پیدا ہوتا ہے، مثلاً یہ امر کہ معشوق کا ایک ایک عضو یا ایک ایک ادا دلربا ہوتی ہے، یعنی ہر عضو اور ہر ادا کی طرف دل کھینچتا ہے، اس کو اس طرح ادا کرتا ہے،

زپائے تا بسرش ہر کجا کہ مے نگرم — کرشمہ دامن دل مے کشد کہ جا اینجاست

اس شعر سے یہ تصویر پیش نظر ہوتی ہے کہ معشوق کا سراپا ایک مجلس ہے جس میں بہت سے تماشائی جمع ہیں، اُنہیں میں دل بھی ہے، کرشمہ، معشوق کے پیش خدمتوں میں ہے دل اس مجلس میں جب آجاتا ہے تو جدھر اس کا گذر ہوتا ہے، کرشمہ دامن پکڑ کر کھینچتا ہے کہ یہیں بیٹھ جاؤ،

دو نیم گشتہ دل از کفر و دین نمے دانم — کزیں دو پارہ دل، آید ترا بکار کدام

مقصد یہ تھا کہ دل میں کفر اور ایمان دونوں قسم کے خیالات جمع ہیں یا دونوں طرف اس کا میلان ہے، معلوم نہیں تجھ کو کیا پسند ہے، اس خیال کو اس صورت میں پیش نظر کرتا ہے کہ کفر اور اسلام نے دل کے دو ٹکڑے کر دیئے ہیں، معلوم نہیں کہ ان دونوں ٹکڑوں میں تیرے کام کا کون ہے،

کوز خسم عاشقانہ کہ در جلوہ گاہِ حُسن　　صد چاک دل بہ تار نگاہے رفو کنند.
دل شکستہ دراں کوے مے کنند درست　　چناں کہ خود نشناسی کہ از کجا بشکست

کہنا یہ تھا، کہ معشوق کی گلی میں جانے سے رنج و غم اس طرح دور ہو جاتے ہیں گو یا کبھی تھے ہی نہیں، اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے کہ دل گو یا ایک شیشہ ہے، معشوق کی گلی میں شیشہ سازی کا کارخانہ ہے، وہاں یہ شیشہ اس طرح جوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ بھی نہیں معلوم ہو سکتا کہ کہاں سے ٹوٹا تھا،

دیدنش بر دیدنِ من حسرت دیگر فزود　　خواستم پیکان بر آرم از جگر، نشتر شکست
مے روم جائے کہ غم آں جا زدلہا مے رود　　نالہ از ہر جا کہ بر مے خیزد آں جا مے رود
دل بردہ در دل باختن معشوق عاشق پیشہ بیں　　بگرفتہ در انداختن، بازوے چالاکش نگر

شعر کا مطلب یہ ہے کہ معشوق کسی اور معشوق پر عاشق ہو گیا، لیکن معشوقی کی ادائیں اب بھی قائم ہیں، اس لئے عین اُس وقت جب کہ اُس کا دل ہاتھ سے جاتا رہا، اُس نے معشوق کو اپنا عاشق بنا لیا، اس مطلب کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے کہ گو یا دو پہلوان لڑ رہے ہیں ایک پہلوان نے گرتے گرتے داؤں کر کے حریف کو پچھاڑ لیا،

از یک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود　　امشب ز دفتر گلہ صد باب شستہ ایم
اوراکِ حال ما زنگہ مے تواں نمود　　لختے ز حال خویش بسیما نوشتہ ایم
من در پے رہائی و او از پے فریب　　بر سر گرہ زند گرہ ناکشودہ را

کہنا یہ تھا کہ عشق چھوڑنا چاہتا ہوں، لیکن معشوق لطف اور مہربانی کی ایسی لگاوٹیں کرتا جاتا ہے کہ اور عشق بڑھتا جاتا ہے، اس مضمون کو یوں مجسم کر کے دکھاتا ہے کہ ایک دھاگے میں گرہ پڑ گئی ہے، ایک شخص اس کو کھولنا چاہتا ہے، لیکن حریف ایسا تیز دست

ہے کہ ابھی ایک گرہ کھلنے نہیں پاتی کہ اور دوسری گرہ لگادیتا ہے،

دیدہ ام دفتر پیمان وفا حرف بحرف — نام خوبان ہمہ ثبت ست ہمیں نام تو نیست

زبیداد تو حرف مہر را نام و نشان گم شد — کتاب حسن را جزو محبت از میان گم شد

نہ چنان گرفتہ جا بمیان جان شیریں — کہ توان ترا و جان را ز ہم امتیاز کردن

یعنی معشوق اور جان دو چیزیں ہیں جو اس طرح رل مل گئے ہیں کہ پتا لگانا مشکل ہے کہ جان کہاں ہے اور معشوق کہاں،

بہر زخمے کہ میگیرند کالاے وفا خوب ست — پس از عمرے گذر افتاد بر ما کاروانے را

۴- اسی خصوصیت کے سلسلہ میں یہ بھی داخل ہے کہ **نظیری** اکثر حالات اور کیفیات کی تشبیہ مادیات اور محسوسات سے دیتا ہے، اور اس لئے اس سے ایک خاص استعجاب کا اثر پڑتا ہے کیونکہ جب دو مخالف چیزوں میں تناسب اور تشابہ نظر آتا ہے تو طبیعت میں استعجاب پیدا ہوتا ہے اس قسم کے اشعار نظیری کے ہاں کثرت سے ہیں، مثلاً

شکوہ نقصان داشت فصلے از میان انداختم — نرخ ارزاں بود، کالا در دکان انداختم

یعنی میں معشوق کی شکایت کرتا تھا، تو وہ ناراض ہوتا تھا، اس لئے میں نے تقریر کا یہ حصہ حذف کر دیا، اس کو یوں تشبیہ دی، کہ چونکہ دام اچھے نہیں اُٹھتے تھے، اس لئے میں نے سودا اُٹھا کر دُکان میں ڈال دیا،

بس غنچۂ نشگفتہ بتاراج خزاں رفت — رسم ست کہ رہزن زند از قافلہ پس را

حُسن چندے سر بدل شوخی و رعنائی دہد — شہ چو گیرد مملکت اول بہ یغمائی دہد

یعنی حسن ابتدا میں شوخی اور رعنائی سے زیادہ کام لیتا ہے کیونکہ بادشاہ جب کوئی ملک فتح کرتا ہے تو پہلے لوٹنے والوں کے حوالہ کرتا ہے کہ لوٹ لیں، حُسن بادشاہ ہے اور شوخی

ورعنائی فوج کے ساتھ کے لٹیرے ہیں،

زاظہار محبت بر زبان خلق افتادم چو محتاجے کہ گنجے یابد و ظاہر کند زود ش

بوصلش تا رسم صد بار در خاک افگند شوقم کہ تو پرواز م و شاخے بلندے آشیان دارم

آں دہد در گریہ پند ما کہ با ما دشمن ست ہر کہ مے گیرد شنا در را بدریا دشمن ست

پس از وارستگیہا، بیشتر گشتم گرفتارش چو صیدے جست صیادش زاول سخت تر گیرد

یعنی ایک مرتبہ دل معشوق سے چھوٹا اگر پھر جو گرفتار ہوا تو سخت گرفتار ہوا، قاعدہ ہے شکاری کے ہاتھ سے جب کوئی شکار چھوٹ جاتا ہے اور پھر ہاتھ آتا ہے تو شکاری اس کو خوب مضبوط پکڑتا ہے کہ پھر چھوٹنے نہ پائے،

از شوق شہیدانِ حریم سر کویش چوں دانہ در آغوش نگنجند زمین را

ہمہ شب برلب و رخسار و گیسوے زنم بوسہ گل و نسرین و سنبل را صبا در خرمن ست امشب

یعنی میں لب، رخسار، اور بالوں کو چومتا ہوں، گویا نسرین اور سنبل کے خرمن میں صبا گھس گئی ہے،

محبت در دل غم دیدہ الفت بیشتر گیرد چراغے را کہ دودے ہست در سر زود در گیرد

یعنی جو دل ایک مرتبہ عشق میں گرفتار ہو چکا ہے، بہت جلد عشق سے متاثر ہو جاتا ہے، جس طرح وہ بجھا ہوا چراغ جس سے ابھی دھواں نکل رہا ہے جلانے سے بہت جلد جل اٹھتا ہے،

زمہر بوالہوس گر دولت عاشق نے گردد طفیلی جمع شد چنداں کہ جاے میہماں گم شد

یعنی ہوس پرستوں سے معشوق کو اس قدر اُنس ہے کہ عاشقوں کو نہیں پوچھتا طفیلی اتنے جمع ہو گئے ہیں کہ مہمان کی جگہ نہیں رہی،

بغیر دل ہمہ نقش و نگار، بے معنی ست — ہمیں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا ایں جاست

یعنی گو سب کچھ ہو، اگر دل صاف نہیں تو کچھ نہیں، گویا ایک کتاب میں بہت سے ورق تھے، لیکن جس ورق پر سیاہی گر گئی ہے اصلی مطلب وہیں تھا،

تا کے چو موج آب بہر سو شتافتن — در عین بحر پائے چو گرداب بمند کن

بر نمے آید ہلال عید م از ابر امید — عمر رفت و ہمچو طفلان بر در و بامم ہنوز

دلم از نالہ خوش گردید، امید، اثر باشد — بسے آسودہ[1] شستم ایں خدنگم کار گر باشد

شکاریوں کا خیال ہے کہ جب تیر نشانہ پر لگتا ہے تو چٹکی کو آرام معلوم ہوتا ہے شعر کا مطلب یہ ہے کہ میں نے اب کے جو نالہ کیا اُس سے میری طبیعت بہت محظوظ ہوئی اس سے قیاس ہوتا ہے کہ نالہ میں اثر ہوگا، جس طرح چٹکی کو جب لطف محسوس ہوتا ہے تو ضرور وہ تیر نشانہ پہ لگتا ہے،

چو خانۂ سر کشت ست عہد را بنیاد — ز ہر طرف کہ نسیمے وزید روزن شد

کھیت کی حفاظت کے لئے جو چھپر وغیرہ بنا لیتے ہیں، اُس کو خانہ کشت کہتے ہیں کہتا ہے کہ معشوق کے وعدے ایسے ہیں، جیسے خانۂ کشت کہ جدھر سے ہوا کا ذرا جھونکا آیا سوراخ ہو گیا،

خدنگ جبۂ توفیق امشب در کمانم بود — غزالم در نظر بسیار خوب آمد خطا کردم

کہنا یہ تھا کہ آج میں معشوق کے ظلم سے تنگ آ کر اس کے حق میں بد دعا کرنی چاہتا تھا لیکن اس کے حسن کا خیال آیا، اور رُک گیا، اس کو یوں ادا کرتا ہے کہ ہرن سامنے آیا میں تیر چلہ میں جوڑ چکا تھا، لیکن ہرن کی ادائیں اس قدر آنکھوں میں کھب گئیں کہ میں نے دانستہ

[1] یعنی میری چٹکی کو بہت آرام اور لطف محسوس ہوا،

چھوڑ دیا،

۴۔ وہ اکثر عشق اور عاشقی کی سچی اور صحیح وارداتیں بیان کرتا ہے، اس لئے دل پر اُن کا خاص اثر ہوتا ہے،

خواہی کہ تو بیش شود عشق نظیری — گاہ از نظر خویش بران گاہ نگہ دار

معشوق سے کہتا ہے کہ اگر تم چاہتے ہو کہ نظیری کا عشق اور بڑھے، تو کبھی اُس کو اپنی نظر سے گرا دو، اور کبھی محبت کی نظر سے دیکھ لو۔

قاصد جگرم سوخت چہ پیغام و چہ نامہ — دل بود ہمان خوش کہ بامید خبر بود

باوجود ناامیدی بس کہ مشتاق توام — مدعی گر مژدۂ وصلم دہد باور کنم

کس قدر عجیب لیکن سچی بات ہے، انسان جب کسی بات کا نہایت مشتاق ہوتا ہے تو اس کے ہونے کی خبر اگر دشمن بھی آکر بیان کرے تو انسان شوق کی وجہ سے یقین کر لیتا ہے اس بنا پر کہتا ہے کہ معشوق کے وصل کی خوشخبری خود رقیب بھی آکر دے تو مجھ کو یقین آجائی،

بمہربانی او اعتماد نتوان کرد — کہ تازہ عاشقم و خاطرش بمن صاف ست

این دل کہ در وصال تسلی ازو نبود — خرسندش از تغافل و دشنام کردہ ایم

یعنی ایک وہ وقت تھا کہ وصل حاصل تھا لیکن تسلی نہیں ہوتی تھی، اور اس سے بھی زیادہ کسی چیز کو دل چاہتا تھا، یا یہ حالت ہے کہ وصل کا کیا ذکر ہے، معشوق نظر تک اُٹھا کر نہیں دیکھتا، اس مایوسی کی حالت میں اگر اتفاقاً اُس نے کبھی گالی بھی دیدی تو خوش ہوتا ہوں کہ آگے کے لئے امید بندھتی ہے،

کس از معانقۂ روزِ وصل یابد ذوق — کہ چند شب زہم آغوشِ خود جدا خفت ست

شد عمر در گرانی او بر طرف نشد — با ما بقدر مرتبۂ عشق ناز کرد

پایم بہ پیش از سر این کو نمے رود — یاران خبر دہید کہ این جلوہ گاہ کیست

مردم از شرمندگی تا چند باہر ناکسے — مردمت از دور بنمانید و گویم "یار نیست"

ایک خاص واقعہ کی تصویر کھینچدی ہے، حالت یہ ہے کہ معشوق اکثر کمینوں اور ہوس پرستوں کے ساتھ رہتا ہے، لوگ جب اس کو کہیں راستہ میں کمینوں کے ساتھ جاتا ہوا دیکھتے ہیں تو دور سے عاشق (نظیری) کو دکھا کر کہتے ہیں، دیکھو تمہارا یار جاتا ہے، عاشق غیرت کے مارے کہتا ہے کہ نہیں میرا معشوق نہیں کوئی اور ہو گا،

مشاطہ را بگو کہ بر اسباب حسن را — چیزے فزون کند کہ تماشا بما رسید

باعث راندنم از بزم بجز عار نبود — ورنہ کس را بمن و بودن من کار نبود

از یک حدیث لطف کہ آں ہم دروغ بود — امشب نزد دفتر گلہ صد باب شستہ ایم

یعنی معشوق نے ذراسی مہربانی سے بات کہی اور تمام شکایتیں جاتی رہیں،

مرا بسادہ دلیہاے من توان بخشید — خطا نمودہ ام و چشم آفرین دارم

مے گریم و از گریہ چو طفلان خبرم نیست — در دل ہوسے ہست و ندانم کہ کدام ست

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے دل میں عشقیہ درد اور گداز پیدا ہوتا ہے لیکن ابھی کوئی معشوق متعین نہیں، اس لئے وہ سمجھ نہیں سکتا کہ یہ حالت کیوں ہے، اور اس کی تمثیل کس قدر عمدہ دی ہے، بچے روتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ کیوں روتے ہیں؟ کیونکہ ان کو جو تکلیف ہے اس کے سمجھنے کی ان کو عقل نہیں،

ہماں عشق ست بر خود بستہ چندیں داستان ورنہ — کسے بر معنی یک حرف صد دفتر نمے سازد

بغل از نامۂ احباب پُر کردو نمے خواند — کہ مے ترسد، شود مکتوب من ہم از میان پیدا

عاشقوں کے خطوط کا چُنگ ہاتھ میں ہے لیکن کھول کر پڑھتا نہیں کہ کہیں خط میرا

نہ نکل آئے،

من نخواہم رفت اما بہر تسکین دلش — ہر کجا بینید گوئید کش کہ فردا مے رود

یعنی میں اُس کی گلی سے جاؤں گا تو نہیں، لیکن تم لوگ اُس سے ملنا تو کہدینا کہ کل چلا جاؤنگا،

غنچ وافسون زلیخا کار در یوسف نہ کرد — ہر کو دل در باخت دل بردن نمیداند کہ چیست

نوازشے ز کرم مے کند محبت نیست — توان شناختن از دوستی مدارا را

یعنے معشوق جو مہربانی کرتا ہے انسانیت کے لحاظ سے کرتا ہے، محبت نہیں محبت اور مدارا میں جو فرق ہے اس کی تمیز خود ہو سکتی ہے،

نظیری کوے عشق ست این شاہد بازی و رندی — کہ گر یارے رود از دست کس، یارے دگر گیرد

مشو از حال من غافل کہ زخمے کارئے دارم — مبادا دیگرے صید ترا از خاک برگیرد

بہر زخمے کہ مے گیرند کالاے وفا خوب ست — پس از عمرے گذر افتاد بر من کاروانے را

سوالے کن ز من امروز تا غوغا بشہر افتد — کہ اعجاز فلانی کرد گویا بے زبانی را

مجلس چو بر شکست، تماشا بما رسید — در بزم چوں نماند کسے جا بہ ما رسید

۵۔ نظیری کے کلام میں فلسفہ کم ہے، لیکن جس قدر ہے نہایت خوبی سے ادا ہوا ہے،

بر چہرۂ حقیقت اگر ماند پردۂ — جُرم گناہِ دیدۂ صورت پرست ہاست

چنداز موذّن بشنوم توحید شرک آمیز را — کو عشق تا یکسو نہم شرع خلاف انگیز را

خضر صد منزل بہ پیشم آمد و نشناختم — بازمے باید ز سر گیرم رہ بیہودہ را

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جو دلیلیں ہمارے سامنے پیش کی گئیں، یا جو مسائل ہمارے سامنے آئے وہ صحیح تھے، لیکن ہم نے اپنی بے پروائی یا کج طبعی یا گرم مزاجی کی وجہ سے اُس سے فائدہ نہیں اُٹھایا، اس سلئے ہم کو نئے دلائل کی ضرورت نہیں، اُنہیں دلائل کو غور

سے مکرر دیکھنا چاہئے اسی خیال کو اس شعر میں ادا کیا ہے،

ہرگز عطاے ساقی مارا کرانہ نیست
از تنگ ظرفی ست کہ پیمانہ پُر شدہ است

زیں پیش شیشۂ دل ماہم زسنگ بود
بے نسبت آشنا دلِ ما با دلِ تو نیست

شیشہ پتھر سے بناتے ہیں، اس بنا پر کہتا ہے کہ میرے دل کو جو تیرے دل سے ربط ہے، بے وجہ نہیں ہے، یہ شیشہ بھی (عاشق کا دل) پہلے پتھر تھا (معشوق کا دل پتھر ہوتا ہے) اس لئے ایک قسم کی مناسبت ہے،

اس شعر میں میلان جنسیت کے مسئلہ کو عاشقانہ پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

ہیچ کس نامۂ سربستۂ ما فہم نہ کرد
نہ ہمیں خاتمہ اش نیست کہ عنوانش نیست

یعنی دنیا کے آغاز و انجام کی حقیقت معلوم نہیں ہوسکتی،

تو مپندار کہ ایں قصہ زخود مے گویم
گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

یعنی جو کچھ کہتا ہوں دل میں القا ہوتا ہے تب کہتا ہوں،

گر عکس روے خویش در آئینہ دیدۂ
توحید شیخ و شرک برہمن بجا شناس

یعنی توحید اور شرک دونوں صحیح ہیں، کیونکہ بت میں بھی کوئی جلوہ ہے جس پر برہمن نثار ہے،

حور و جنت جلوہ بر زاہد دہد در راہ دوست
اندک اندک عشق بر راہ آورد بیگانہ را

یعنی خشک طبع زاہد، معرفت الٰہی کی طرف یوں نہیں مائل ہوسکتے، اس لئے اُن کو حور اور جنت کی چاٹ دلائی جاتی ہے، اس لالچ سے جب وہ ذکر اور شغل میں مصروف ہوتے ہیں تو رفتہ رفتہ جذب الٰہی بھی پیدا ہوجاتا ہے،

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نرسد
کفر آوردم و در عشقِ تو ایمان کردم

کفر و ایمان بنود شرط نظیری در عشق
بتو کافر بنمایم کہ ولایت دارد

روے نکو معالجۂ عمر کوتہ است | ایں نسخہ از بیاض مسیحا نوشتہ ایم
مارا چہ اعتبار روا اثر باوجود دوست | جائے کہ جلوہ کرد حقیقت مجاز نیست
حسن ہر سو در لباس دیگری پنہاں شود | عشق ہر ساعت در آویزد بداماں دگر
بہر کارے کہ ہمت سے گماری نصرت از حق جو | کہ بر کنجشک دام افگندم و صید ہما کردم
تاکے چو موج آب بہر سو شتافتن | در عین بحر، پاے چو گرداب بند کن
دریں میدانِ پرنیرنگ حیران ست دانائے | کہ یک ہنگامہ آرائی ست و صد کشور تماشائے
در طبع دوستان ز حسد راستی نماند | انصاف اگر طلب کنی از دشمنان طلب

تعجب یہ ہے کہ **نظیری** اگرچہ نہایت مذہبی آدمی تھا، اور اکبر اور ابوالفضل کی لامذہبی پر نہایت لعن طعن کرتا ہے لیکن خود وہی خیالات ظاہر کرتا ہے جو اُس زمانے میں ابوالفضل وغیرہ کی طرف منسوب تھے، چنانچہ کہتا ہے،

بوالبشر را قوے ملائکہ اند | جزو و کل راست در سجود ایں جا
حضرت آدم کے قوی بھی فرشتہ ہیں، | اور جُزو، کل کو سجدہ کر رہا ہے
نزد تو جبریل وحے آورد | عقل بر قع ز رخ کشود ایں جا
تمہارے نزدیک تو جبریل وحی لاتے، | لیکن دراصل وہ خود عقل تھی

۶- اس زمانے کے تمام نامور شعرا کا اصلی جوہر طرزِ ادا کی جدت ہے، **نظیری** اس میدان میں اکثر حریفوں سے آگے ہے،

عشق را کام بعہد دل خود کام تو نیست | صبح امید شب وصل در ایام تو نیست
(گو یا اس میں ایک صبح اور ایک رات کم ہے،)
از کف نمے دہد دل آسمان ربودہ را | دیدیم زور بازوے ناآزمودہ را

بازم بہ کلبہ کیست نہ شمع ونہ آفتاب　　بام و درم ز ذرہ و پروانہ پر شدہ است

میرے گھر میں کون آیا ہے کہ نہ دھوپ ہے نہ شمع، باوجود اس کے درو دیوار پر ذرّے اور پروانے ٹوٹ پڑے ہیں (یعنی معشوق آفتاب بھی ہے اور شمع بھی)،

بے تو دو شم در درازی از شب یلدا گذشت　　آفتاب امروز چوں برق از سرائے ما گذشت

ہیبت حسنش کسے را رخصت آہے نداد　　گرچہ ہر سو داد خواہی بود، او تنہا گذشت

در آرزوے نثار قدم تو ہمہ شب　　گہر فروش دو چشم مراد کان باز ست

دعا کنید بوقت شہادتم او را　　کہ ایں دمے ست کہ درہائے آسمان باز ست

اس شعر میں جدت ادا کے ساتھ ایثار نفس کے مضمون کو نہایت بلاغت کیساتھ ادا کیا ہے عاشق قتل کیا گیا ہے، اس تقریب میں آسمان کے دروازے کھل گئے ہیں، اس حالت میں عاشق کو سب سے پہلے جو خیال آتا ہے وہ یہ ہے کہ معشوق کے حق میں لوگوں کو دعا کرنی چاہئے کیونکہ یہ قبول دعا کا وقت ہے،

عارفان گوشۂ چشمے بدو عالم ندہند　　ہر کجا یار نقاب از رخ زیبا برداشت

ع - ایں قبلۂ کہ کج شدہ، طرف کلاہ کیست،

گرچہ میدانم قسم خوردن بجانت خوب نیست　　ہم بجانِ تو کہ یادم نیست سوگندِ دگر

اس شوخی کو دیکھو، کہتا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ تمہاری جان کی قسم کھانا اچھی بات نہیں، لیکن تیری جان ہی کی قسم کہ مجھ کو اور کوئی قسم یاد نہیں، شوخی اور بلاغت یہ ہے کہ قسم نہ کھانے پر بھی قسم کھائے جاتا ہے، اور اس لطف سے کہ گویا اس کو خبر نہیں کہ اس نے قسم کھالی اسی میں یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ اس کو اور کوئی قسم یاد نہیں،

قسمت چنیں فتاد کہ ترکان مست او　　در دورِ ما بطاق نہادند جام را

کہنا یہ تھا کہ ہم معشوق کی نگاہ سے محروم ہیں، اس کو یوں کہتا ہے کہ ہماری قسمت ایسی واقع ہوئی کہ ہمارے زمانے میں اِن ترکوں (معشوقوں کی آنکھیں) نے پیالہ اُٹھا کر طاق پر رکھدیا اور شراب پینی پلانی چھوڑ دی،

ہیچ دل را ستم حادثہ مجروح نہ کرد کہ نہ لعل تو بر و ریخت نمکدانے چند
تو گر برہم زنے سودائے دل نازے زیاں داری مرا سرمایۂ دنیا و دین نابود مے گردد

یعنی دل کی خرید و فروخت کا جو معاملہ طے ہو چکا ہے، اُس کو تو اگر توڑ دے تو تیرا صرف ایک ناز ہی کا نقصان ہوگا، لیکن میرا تو دین اور دنیا کا جو کچھ سرمایہ ہے (یعنی دل) سب جاتا رہے گا،

چناں برہم زدی ہنگامۂ شور قیامت را کہ اکثر نامۂ اعمال مردم از میان گم شد
با تو گستاخی ست گفتن ترک بدخوے تما بادل خود گفتہ ام آئینہ را بے زنگ ساز

مقصد یہ ہے کہ معشوق تو بد مزاجی چھوڑ نہیں سکتا، اس لئے میں نے اپنے دل کو برداشت کرنے کی عادت ڈال دی ہے، اس مطلب کو یوں ادا کرتا ہے (معشوق سے مخاطب ہو کر) تم سے یہ کہنا تو گستاخی ہے کہ بد مزاجی چھوڑ دو، لیکن میں نے اپنے دل سے کہہ دیا ہے کہ آئینہ ایسا بناؤ جس کو زنگ نہ لگنے پاتے،

بدل طرحِ وصالِ جاودانی نقش مے بندم اگر خود دوست مے آید بخلوت دشمن ست امشب
عشق بازیم بمعشوق مزاجی انداخت زاں نیازے کہ بہ اوہست مرانازے ہست

یعنی عشق کرتے کرتے مجھ میں معشوق مزاجی آگئی، مجھ کو اس پر ناز ہے کہ میں اُس کا نیاز مند ہوں،

میخواست بوسہ رخصت اقامت بگسترد از فرش جبہ راہ براں خاک کو نبود

مقصد یہ ہے کہ میں اُس کی گلی کی خاک کو بوسہ دینا چاہتا تھا، لیکن اس قدر کثرت سے لوگ پیشانی رگڑ رہے تھے کہ جگہ نہ تھی، اس مطلب کو یوں ادا کرتا ہے کہ بوسہ نے چاہا کہ وہاں قیام کے لئے بستر بچھائے، لیکن پیشانیوں کا فرش بچھا ہوا تھا، اس لئے جگہ نہ تھی،

دہر چوں در دشمنی سست افگندم بپر　　دشمن نامرد را امن مرد میدان نیستم

دریں عشرت کہ من جان مے سپارم　　نمے گریہ بمرگم مادرم امروز

قاصد کہ می فرستی رطل گرانش در دہ　　کز ما خبر نیابد تا بے خبر نباشد

یعنی قاصد جو بھیجنا تو خوب شراب پلوا کے بھیجنا، کیونکہ جب تک خود بیخبر نہ ہوگا، میری خبر اس کو نہ معلوم ہوسکے گی، مطلب یہ ہے کہ جب تک عشق آشنا نہ ہوگا، میرے عشق کا حال کیا جان سکے گا،

در دیارے کہ سجود خمِ ابرو رسم ست　　غیر محرابِ کج قبلۂ ویران مطلب

مقصد یہ ہے کہ جہاں عشق کا چرچا ہوگا، وہاں زہد و عبادت کرنا بے فائدہ ہے،

گرہ بر جبین ابرو از چہ داری　　سرایں نامۂ پیچیدہ بکشا

اگر بمعرکہ در خون فتادہ ام چہ عجب　　ہمیشہ رزم بخود چوں تہمتنی است مرا

ایک دقیق خیال کو ادا کیا ہے، کہنا یہ ہے کہ میں دوسروں کی رائے پر تو غالب آجاتا ہوں لیکن خود میرا دل میرا مخالف رہتا ہے، اور اُس کی خواہشوں کو مغلوب کرنا پڑتا ہے اس میں مجھ کو اکثر ناکامی ہوتی ہے اور نقصان اُٹھاتا ہوں، اس خیال کو یوں ادا کرتا ہے، کہ اگر میں معرکے میں زخمی ہوں تو کیا تعجب، کیونکہ مجھ کو اپنے جیسے رستم سے لڑنا پڑتا ہے یعنی میں خود رستم ہوں اور اپنے آپ سے لڑتا ہوں،

کمر در خدمتت عمرے ست مے بندم چہ شد قدرم　　برہمن مے شدم، گر ایں قدر زنّار مے بستم

۷۔ وہ غزلوں میں کسی حالت کو مسلسل لکھتا جاتا ہے، اور غزل کی غزل اسی ایک حالت کے بیان میں تمام ہو جاتی ہے، ان موقعوں پر اندازہ ہو سکتا ہے کہ وہ ایک مضمون کی تمام جزئیات کو کس طرح احاطہ کرتا ہے، کس خوبی سے تسلسل بیان کو قائم رکھتا ہے، کس طرح عشق و عاشقی کی ایک ایک ادا سے واقف ہے، اس کے ساتھ رنگینی استعارات، جدت اسلوب، اور شیریں زبانی، کلام کو سحر سامری بنا دیتی ہے، مثلاً ایک غزل میں وصل کی حالت ادا کرتا ہے،

دارم دریں دیار مغاں شیوہ دلبری — بیخود خوش و میانہ خوش و ہوشیار خوش

اس شہر میں میرا ایک معشوق ہے جس کی ادائیں مغبچوں کی سی ہیں، وہ مستی میں بھی، ہوش میں بھی، اور درمیانی حالت میں بھی خوش ادا ہے،

دستار افگند خم کاکل پراگند — کایں ست وضع صحبت و زیں ساں نگار خوش

ٹوپی اُتار کر رکھ دیتا ہے اور بالوں کو بکھرا دیتا ہے، اس لئے کہ صحبت کا یہی انداز ہے اور معشوق اسی رنگ میں دلکش معلوم ہوتا ہے

شاد و شگفتہ مطرب و ساغر طلب کند — یک سو نہد حجاب، و در آید بکار خوش

خوشی سے کھل جاتا ہے اور مطرب اور شراب طلب کرتا ہے، شرم اُٹھا دیتا ہے اور کام میں لگ جاتا ہے،

ہر گہ کند شتاب بہ رفتن کہ دیر شد — تسکیں دہم دلش کہ سکون و قرار خوش

جب جانے کے لئے جلدی کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دیر ہوتی جاتی ہے تو میں اس کو روکتا ہوں کہ سکون اور قرار اچھی بات ہے،

تادم زند کہ روز چہ رفت، او زہفتہ چیست
نگذارمش شمار کہ نبود شمار خوش

جب یہ پوچھنا چاہتا ہے کہ کون سا ہفتہ ہے؟ اور دن کتنا چڑھا؟ تو میں اس کو یہ پوچھ گچھ کرنے نہیں دیتا، کیونکہ پوچھ گچھ اچھی بات نہیں،

او در وداع و من بجزع کز مے و بہار
رطلے سہ چار ماندہ و روزے سہ چار خوش

وہ رخصت ہونا چاہتا ہے اور میں روتا ہوں کیونکہ شراب اور بہار میں سے یہی دو تین پیالے اور دو تین دن مزے کے رہ گئے ہیں،

ساغر کنم لباب و گویم سبک بنوش
در موسم بہار نہ باشد خمار خوش

میں پیالہ بھرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ آہستہ سے چڑھا جا، کیونکہ بہار میں خمار اچھی چیز نہیں،

چنداں کہ گویمش گذران ست عمر باش
گوید صبا روانہ بہ و گل سوار خوش

میں ہر چند کہتا ہوں کہ عمر گذری جاتی ہے، ذرا ٹھہر جاؤ، وہ کہتا ہے کہ صبا کا روانہ ہونا ہی اچھا ہے اور پھول کا سفر کرنا ہی بہتر ہے،

کارے بہ لابہ پیش نظیری نمی رود
باشد با دگذاشتن اختیار خوش

اے نظیری! اب خوشامد کچھ پیش نہیں جاتی اس لئے اب اسی کی مرضی پر چھوڑ دینا چاہئے،

ایک غزل میں یہ حالت بیان کی ہے کہ معشوق خود کسی حسین پر عاشق ہو گیا ہے، اس حالت میں جو جو واقعات پیش آسکتے ہیں ان کو بیان کیا ہے، اور کس دلآویزی سے بیان کیا ہے،

چشمش براہے میرود مژگان نمناکش نگر
در سینہ دارد آتشے، پیراہن چاکش نگر

دامے کہ زلف انداختہ در گردن سیمینش بین
خونے کہ مژگان ریختہ بر دامن پاکش نگر

زلف نے جو جال ڈالا تھا اب خود اس کی سیمین گردن میں ہے، مژگان نے جو آنسو گرائے ہیں اس کے پاک دامن پر پڑے ہوتے ہیں،

شرم از میان برخاستہ مُہر از دہان برداشتہ　　گفتار بے ترس بین رفتار بیباکش نگر

شرم اور حجاب جاتا رہا، زبان کھل پڑی، اس کی بے جھجک باتیں اور بیباکانہ رفتار دیکھنے کے قابل ہے،

از کوے معشوق آمدہ شوریدگان درحلقہ اش　　از صید آہوے رسد شیران بفتراکش نگر

معشوق کی گلی سے آیا ہے، اور عاشقوں کا جھرمٹ ساتھ ہے، ہرن کو شکار کر کے آیا ہے اور فتراک میں شیر ہیں،

دل بردہ در دل بافتن معشوق عاشق پیشہ بین　　بگرفتہ ور انداختن بازوے چالاکش نگر

عاشقی میں معشوقی دیکھو کہ دوسرے کو دل دیتے دیتے خود اس کا دل اڑا لیا۔

۸۔ **نظیری** نے روزمرہ اور محاورات نہایت کثرت سے برتے ہیں، جس سے زباندانی میں بہت مدد ملتی ہے، اس کے ساتھ اکثر محاورات وہ ایسے استعمال کرتا ہے کہ جس مطلب کو ادا کرنا چاہتا ہے بغیر اس محاورہ کے وہ اس خوبی کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتا تھا، مثالوں سے اس کا اندازہ ہوگا،

ع، طفل بودیم کہ باز از شکر و شیر شدیم　　از شیر باز شدن، دودھ چھڑایا جانا،

ع، سخت است حال مشکل اگر تا سحر کشم　　حالت سخت ہی مشکل ہے کہ صبح تک بچ جاؤں

ع، شبنم بروی بستر و نرگس بخواب گیر　　بخواب گرفتن، سوتے میں جا لینا،

ع، نیم بسمل شدہ برسر پروازے ہست　　برسر پرواز، اُڑنے کو ہے،

ع، شرح سوداے ترا نسخہ زسیما برداشت　　نسخہ برداشتن، کتاب کا نقل کرنا،

ع، شب آخر گشتہ و افسانہ از افسانہ می خیزد　　افسانہ از افسانہ میخیزد، بات میں سے بات نکلتی ہے،

اس قسم کے سینکڑوں روزمرے اور محاورے اس کے کلام میں مل سکتے ہیں،

طالب آملی

ملک الشعرائے دربار جہانگیری

سلسلۂ تیموریہ میں یوں تو ہر فرمان روا، سخن فہم و اداشناس گذرا ہے لیکن جہانگیر اس فن میں اجتہاد کا درجہ رکھتا تھا، وہ فطرۃً محبت کیش تھا اور ازل سے دردمند دل لے کر آیا تھا اس کا اثر اگرچہ اُس نے آئینِ نظام سلطنت میں چنداں نمایاں نہ ہونے دیا، یہاں تک کہ تزک میں نورجہان کا جہاں جہاں ذکر آیا ہے مطلق نہیں معلوم ہوتا کہ یہ نام اس کی زبان سے لذت لے کر نکلتا ہے تاہم عشق اس کا خمیر تھا اور چونکہ فیضی کا شاگرد رشید تھا، اس لئے شعر و شاعری کا نکتہ دان اس سے بڑھ کر کون ہو سکتا تھا، شہزادگی کے زمانہ سے شعرا اس کے دربار میں ملازم رہتے تھے، تخت سلطنت پر بیٹھا تو دربار شعرا سے بھرا ہوا تھا لیکن ملک الشعرائی کا تاج اس نے طالب آملی کے سر پر رکھا جس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ شاعر کس پایہ کا ہوگا، یہ بھی پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس وقت طالب کا سن ۲۰ برس سے زیادہ نہ تھا، اس عمر میں یہ اعزاز خاص اسی شاعر کا کارنامۂ اقبال ہے،

طالب آمل کا رہنے والا تھا۔ جو مازندران کا ایک شہر ہے، بچپن میں درسی علوم و فنون کی تعلیم پائی، اور اگر اس کے دعوے پر اعتبار کیا جائے تو ۱۵، ۱۶ برس کی عمر میں اس نے ہندسہ، منطق، ہیئت، فلسفہ، تصوف اور خوشنویسی میں کمال حاصل کر لیا تھا، چنانچہ ایک قصیدہ میں لکھتا ہے،

پا بہ دہ ننہادہ پایۂ اوجِ عشر اتم[1] | واینک عدد فہم از آلاف زیادہ است

[1] یعنی ابھی میں نے دوسری دہائی میں قدم رکھا ہے

بر ہندسی و منطقی و ہیئت و حکمت | دستی است مرا کش ید بیضا ز عباد است
دین جملہ چو طے شد نکنین علم حقیقت | کاستاد علوم ست بریں جملہ مزاد است
در سلسلۂ وصفِ خط ایں بس کہ زکلکم | ہر نقطہ سویدائے دلِ اہل سواد است
پوشیم نسب شعر، چو دانم کہ تو دانی | کایں پایہ مرا تا من ایں سبع شداد است

گو رواج عام کے لحاظ سے اس نے یہ تمام علوم حاصل کئے، لیکن وہ دراصل شاعری کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اسی کو اپنا فن قرار دیا،

اس زمانہ میں مازندران کا حاکم جس کو ایران کی اصطلاح میں وزیر کہتے تھے، میر ابو القاسم تھا اس کی مدح میں متعدد قصائد لکھے، ایک قصیدہ کا یہ مطلع ہے اور غالباً یہ پہلا قصیدہ ہے،

سحر کہ غنچہ کشاید گرہ ز پیشانی | زند دم از دم عیسے نسیم بستانی
سحر کہ طرۂ پیچان مشک سائے نسیم | بطرف عارض گلبن کند پریشانی

معلوم نہیں کہ کن اسباب سے یہاں طبیعت سیر ہو گئی اور کاشان میں آیا، یہاں مستقل سکونت اختیار کی، اور شادی بھی کرلی، تذکرہ میخانہ میں لکھا ہے کہ اس کی شاعری کا نشوونما یہیں ہوا، لیکن چند روز کے بعد یہاں سے بھی برداشتہ خاطر ہو کر مرو میں آیا، یہ عباس صفوی کا زمانہ تھا، اور بلکش خاں صوبے کا گورنر تھا، طالب نے بلکش خاں کے دربار میں رسائی حاصل کی، اور مدحیہ قصائد لکھے، دو برس تک یہاں قیام رہا، بلکش خاں نے قدردانی میں کمی نہ کی ہو گی لیکن طالب ہندوستان کی فیاضیوں کا خواب دیکھا کرتا تھا، ایک مثنوی لکھ کر بلکش خاں سے وطن جانے کی اجازت حاصل کی، ابتدا میں لمبی چوڑی تمہید لکھی، پھر حرف مطلب اس طرح ادا کیا،

یکے بر حرف طالب گوش بکشائے	صدف را بر گہر آغوش بکشائے
دو سال آمد کہ از محنت کشاں است	ترا چوں بوسۂ فرش آستان ست
بہ کلی کردہ از مسکن فراموش	یکے گردیدہ رندے خانہ بردوش
نہ از خویشان کند، نز دا قربا یاد	بدیدار تو دارد خویش را شاد
اگر لطف تو اش دستور بخشد	چو خور کو ذرہ را نور بخشد
عناں سوے وطن تابیدہ چندی	کند خویشان خود ارشخندی
دو روزے با غم آشامان سر آرد	دگر رہ سوے طوف ایں در آرد
بدیں درگہ رساند خویشتن را	ز سر بیروں کند شور وطن را

وطن کا بہانہ تو اس لئے تھا کہ ہندوستان کا نام لیتا تو اجازت کیونکر ملتی بیگلش خاں سے رخصت ہو کر، طالب نے سیدھا ہندوستان کا راستہ لیا اور اس وقت یہ رباعی لکھی[1]

طالب! گل ایں چمن بہ بستان بگذار	بگذار کہ، مے شوی، پریشان بگذار
ہندو نہ برو تحفہ، کس جانب ہند	بخت سیہ خویش بہ ایران بگذار

مطلب یہ ہے کہ ہندوستان میں کالی چیز، تحفہ لے کر نہیں جاتے، اس لئے بخت سیہ یہیں چھوڑ کر چلنا چاہئے،

میخانے کے مصنف نے جو خود طالب کا ہمعصر اور ہم صحبت تھا، لکھا ہے کہ طالب مرو سے نکل کر سیدھا قندھار پہنچا، لیکن یہ تعجب انگیز غلطی ہے، قندھار جانے کا حال طالب نے خود ایک قصیدہ میں لکھا ہے، اس سے صراحۃً ثابت ہے کہ وہ ہندوستان

[1] تذکرۂ میخانہ،

میں برسوں رہ کر قندھار گیا ہے، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے،

قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اول جب وہ ہندوستان میں آیا تو یہاں اس کو کامیابی نہیں ہوئی، اور اس وجہ سے وہ تمام مشہور مقامات میں بہ تلاش معاش پھرتا رہا، دلی، لاہور، ملتان، سرہند ان مقامات کا ذکر اس نے بہ تخصیص کیا ہے، لاہور میں زیادہ دل لگا چنانچہ لاہور کی مدح میں ایک خاص قصیدہ لکھا ہے، جس کے چند اشعار یہ ہیں،

گمانم نیست کاندر ہفت کشور — بود شہرے بہ آب و تاب لاہور
میان بکشاد خوش و اکش کہ در ہند — فراغت نیست جز در خواب لاہور

یہاں اس نے شاہ ابو المعالی کی خدمت میں بیعت حاصل کی، چنانچہ کہتا ہے،

کنم زاں رو مریدآسا شب و روز — کرا متہا بیان در باب لاہور
کہ پیر و دستگیر و مرشد من — یکے قطب است از اقطاب لاہور
خدایا زندۂ جاوید دارش — بہ آب خضر یعنے آب لاہور

ان شہروں میں وہ رندانہ وضع سے رہا اور خرمن حسن کی خوشہ چینی کرتا رہا، خوش قسمتی سے حسینوں نے بھی اپنے پہلو میں اس کو جگہ دی، چنانچہ جب ہندوستان چھوڑکر قندھار جانے لگا ہے تو جس گرمجوشی سے ان فتنہ گروں نے اس کو روکا ہے، اسکی تصویر اس طرح کھینچی ہے،

نگاران لاہور و خوبان دہلی — بدل کردہ بودند پیوند جانم
یکے چہرہ سودے بچشم رکابم — یکے بوسہ دادے بزلف عنانم
فشاندی یکے در بغل، یاسمینم — نہادے یکے در دہان برگ پانم
غزالان ملتان بہ نیرنگ سازی — کہ بندند از غمزہ دست و دہانم

من از جملہ چوں نگہت گل گریزاں | کہ خود را بہ بزم ہمایوں رسانم

اس زمانہ میں **غازی خاں وقاری**، امراے جہانگیری میں نہایت ممتاز تھا، اس کا باپ مرزا جانی سنہ ۱۰۰۱ ہجری میں اکبر کے حکم سے ٹھٹھہ کا صوبے دار مقرر ہوا تھا، سنہ ۱۰۱۰ھ میں جب اس کا انتقال ہوا تو غازیخاں باپ کا جانشین ہوا جہانگیر نے اپنے عہد سلطنت میں اس کو قندھار کا گورنر مقرر کیا، اور سندھ کا علاقہ جاگیر میں دیا، وہ نہایت قابل اور دریا دل تھا، اکثر اہل کمال، مثلاً اسد قصہ خوان، مرشد بروجردی، میر نعمت اللہ وغیرہ نے اس کے دامن تربیت میں تعلیم پائی ہے، ایران سے جو اہل کمال ہندوستان کا رُخ کرتے تھے، ان کی پہلی منزل اسی کا آستانہ ہوتا تھا،

شاعری میں مشہور شعرا کا ہم پلّہ تھا، **وقاری** تخلص کرتا تھا، پانچ ہزار شعروں کا دیوان یادگار ہیں چھوڑا، میخانہ میں اس کے ساقی نامہ کے بہت سے اشعار نقل کئے ہیں، غزل کا یہ رنگ ہے،

در عہدِ تو مارا ہمہ با غیر خطاب است | سر پنجۂ مژگان و گریبان عتاب است

گریہ ام گر سبب خندۂ او شد چہ عجب | ابر ہر چند کہ گریہ رُخ گلشن خندد

کجاست یک دو سہ ہمدم کہ ہمچو موسیقار | نشستہ پہلوی ہم بر کشیم آوازی

غرض اس کی قدردانی کی شہرت نے طالب کو قندھار جانے پر آمادہ کیا، پہلے ایک قصیدہ لکھ کر بھیجا جس میں حاضری کی استدعا کی، تمہید کے بعد اصل مطلب اسطرح ادا کیا،

یکے بلبل بے پرو بالِ شوقم | کہ محرومی از طوفِ گلزار دارم

دریں خستہ آبادی بے ماندن | نہ سامان یک گام، رفتار دارم

ندانم چرا یارب ایں ساں خرابم | چو لطف خداوند، معمار دارم

صف آرائے تیغ وقلم خان غازی — کہ لب در ثنایش گہر بار دارم

بلند آفتابے کہ دور از رکابش — برخ کوکبِ اشکِ سیار دارم

جدا از آستانش زاشکِ دمادم — سر آستین رشکِ گلزار دارم

آگرہ سے لاہور، ملتان ہوتا ہوا قندھار پہنچا، چونکہ برسات کے دن تھے راستہ میں بہت تکلیف اٹھائی، ملتان میں چار مہینے قیام کرنا پڑا، چنانچہ پہلا قصیدہ جو غازی خان کے دربار میں پیش کیا ہے، اس میں یہ تمام حالات لکھے ہیں،

خدائے اندوہ من بندہ کاندریں مدت — چہا کشیدہ ام از حادثات دورانی

دریں سفر کہ نصیبم مباد دیگر بار — بگونہ گونہ غمم بود صحبتِ جانی

تراختلاطی باران برشگالی را — زمن مپرس کہ ایں قصہ نیست پایانی

زاگرہ[1] تا بنجیا بان گلشن لاہور — رفیق بودم با ابرہائے بارانی

بعزم ملتان چوں زورقے شدم چو ہلال — زدا ز سر شکم، نیلاب، کوس عمانی

زنکث ملتان نزدیک شد بر آں کہ مرا — بدل شود لقب آملی بہ ملتانی

دراں مضیقِ ملالت، چہار مہ بودم — بسانِ مہرۂ بششدر تمام حیرانی

غازی خاں نے خاطر خواہ قدردانی کی اور مقربان خاص میں داخل کیا، طالب نے بہت سے پرزور قصیدے اس کی مدح میں لکھے ہیں، جس میں مداحی سے گذر کر عاشقی کا دعوے کیا ہے،

تکلف نیست معشوقِ من ست او نیست ممدوحم — ازاں ایں شعر عشق آمیز، در مدحش سرائیدم

بدقسمتی سے غازی خاں ۱۰۲۰ھ میں جب کہ اس کی عمر صرف ۲۵ برس کی تھی اپنے

---

[1] آگرہ کو ایرانی شعرا ہمیشہ اکرہ لکھتے ہیں،

ایک غلام کے ہاتھ سے مسموم ہوا، طالب کے لئے اب کوئی ٹھکانا نہ رہا، مجبوراً اُس نے پھر ہندوستان کا رُخ کیا اور آگرہ میں آیا، خواجہ قاسم دیانت خاں نے جو امرائے جہانگیری میں حضور رس تھا، اس کی قدردانی کی اور عبداللہ خاں فیروز جنگ کے نام جو اسی سنہ میں گجرات کا حاکم مقرر ہوا تھا، اس کی سفارش میں خط لکھا، عبداللہ خاں نے خط بھیجکر بُلایا طالب نے اس واقعہ کو بڑے فخر اور ناز سے لکھا[۵۱] ہے،

صبا رفتار پیکے، در طلوع صبح نورانی   بگوشم زد صدائے زنگ[۵۲] چوں بانگِ سلیمانی
زسیر آہنگیٔ آں نغمہ مست از جائے برجستم   بہر جانب نگاہے تاختم از روئے حیرانی
یکے باد غبار آلودہ بردر، جلوہ گر دیدم   عرق ریزاں چو مرواریدش از اطرافِ پیشانی
(یعنے قاصد)
دویدم پیش وگفتم خیر مقدم، وانگہ افشاندم   بپا لیش مشتے از ناسفتہ گوہر ہائے مژگانی
گلاب آوردم و پیشانیش از گرد رہ شستم   دریغا کاش بودے قدرتم بر آبِ حیوانی
بپا لیش آشنا کردم بسے وز گرد نعلینش   نمودم سرمہ دانِ دیدہ بر کُحلِ صفاہانی
پس از وے باہزاراں شوق بیتابانہ پرسیدم   کہ اے جاروبِ راہت شہپرِ مرغِ سلیمانی
لبت آبستن رمزے ست، گویا مژدہ داری   کہ مے بارد زرویت ہمچو گل آثارِ خندانی
چو بشنید ایں سخن بکشود لب وانگاہ چوں طوطی   زبان را چاشنی داد از ادائے شکر افشانی
بگفت اے عندلیبِ گلشنِ معنے کہ بر یادت   قدح نوشند، خوش طبعانِ ایرانی و تورانی
بشارت باد کانیک باہزاراں مژدہ آوردم   خطِ آزادیِ مرغِ دلت از دام حیرانی

---

۵۱ آگرہ میں آنے اور قاسم خاں کی سفارش کا حال میخانہ میں لکھا ہے،

۵۲ زنگ گھونگرو کو کہتے ہیں اس زمانے میں ڈاک کے ہرکارے کھونگرو باندھ کر چلتے تھے یہ اُس کی طرف اشارہ ہے،

درا ثنائے تکلم کا غذین دُرجے پر از گوہر ... بوسید و بدستم داد از روئے روش دانی

من آں منشور دولت، چوں بدست خویشتن دیدم ... شدم سرتا قدم بہر سجود شکر پیشانی

بسوئے قبلۂ گجرات رو تسلیم ہا کردم ... بہ آدابے کہ برمن کرد گردون آفرین خوانی

پس از تسلیم بکشودم زعنوان مہر مشکینش ... چو دیدم آفتابے چند در جلباب ظلمانی

شدم شاداب تر، چوں مُہر عنوان را رقم دیدم ... بنام نامی سرچشمۂ توفیق یزدانی

سحاب فیض عبداللہ خاں آں مظہر احسان ... کہ نے بحرے زدست ہمتش جان بردانی کانی

طبیعتوں کا اختلاف دیکھو! **عرفی** کو خود جہانگیر نے قاصد بھیجکر بلایا تھا۔ لیکن وہ قاصد کی نسبت اس قدر کہکر رہ گیا،

کہ ناگہاں زدرم ور رسید مژدہ دہے ... چناں کہ از چمن طالعم بہ مغز شمیم

بخلاف اس کے **طالب** ایک معمولی امیر کے ہرکارے کے پاؤں چومتا ہے اس کی پیشانی کی گرد گلاب سے دھوتا ہے، اور حسرت کرتا ہے کہ آب حیات کہاں سے لاؤں، عبداللہ خاں نے حد سے زیادہ طالب کی عزت کی، اور انعام و اکرام سے مالا مال کر دیا، طالب نے عبداللہ خاں سے درخواست کی کہ آپ دربار میں جائیں، تو مجھ کو بھی ساتھ لیتے چلیں، چنانچہ ایک قصیدہ میں کہتا ہے،

آسمان قدرا! چو داری در خیال ... عزم درگاہِ شہنشاہِ زمان

وز جوان مردانِ ایرانی سپاہ ... برگزیدہ ستے چہل شیر ژیان

گرچہ من در جرگۂ شیران نیم ... لیک از اخلاص دارم چشم آن

کز نظر چوں بگذرد تفصیل اسم ... نام طالب نیز باشد درمیان

غالباً عبداللہ خاں سے یہ خدمت انجام نہ ہو سکی، اس لئے طالب نے اور تدبیریں اختیار کیں،

شاپور طہرانی ایک مشہور شاعر تھا، وہ نور جہان بیگم سے قریبی قرابت رکھتا تھا، یعنی اس کا باپ، اعتماد الدولہ کا جو نور جہان بیگم کا باپ تھا، حقیقی چچا تھا، وہ تجارت کرتا تھا اور اکثر اعتماد الدولہ کے ہاں اس تقریب سے آمد و رفت تھی، طالب نے شاپور سے راہ و رسم پیدا کی، لاہور میں اس سے جا کر ملا، ایک غزل میں اس واقعہ کا ذکر بھی کیا ہے،

بحمد اللہ کہ در ملکِ سخن دستور را دیدم | ہماں رشک عطارد شاعر مشہور را دیدم
بہ خسرو داشتم روے نیاز ے در سخن طالب | از و در سوختم چوں صنعت شاپور را دیدم
چہ خوش حالم کہ بعد از مدت یک سالہ مہجوری | خوش و خوشوقت اورا دیدم و لاہور را دیدم

غرض شاپور کے ذریعہ یا کسی اور تحریک سے اعتماد الدولہ کے دربار میں رسائی ہوئی اعتماد الدولہ نے اس کو دامن تربیت میں لیا اور خاص توجہ مبذول کی، تذکرۂ میخانہ میں لکھا ہے کہ جہانگیر کے دربار میں، اعتماد الدولہ ہی نے اس کی تقریب کی، لیکن اور تذکروں اور دیگر قرائن سے ثابت ہوتا ہے کہ اول اول اس کو دیانت خاں نے دربار میں پیش کیا، جو جہانگیر کی خدمت میں خاص تقرب رکھتا تھا، جہانگیر کے سامنے اس نے طالب کی اس قدر تعریف کی کہ جہانگیر نہایت مشتاق ہوا، دیانت خاں خود ساتھ لے کر گیا لیکن طالب نے حماقت سے چلتے ہوئے مفرح[1] کا استعمال کیا، جس سے اس کے حواس جاتے رہے،

[1] یہ ایک معجون تھا جو شراب کے بجائے استعمال کیا جاتا تھا اور محتاط اس کو شراب کے بجائے کام میں لاتے تھے، کلیم نے اسی کی طرف اس قطعہ میں اشارہ کیا ہے،

بلند قدر اسیر گشتگان وادی غم | مفرحے پئے دفع ملال مے خواہند
چو بادہ بے تو حرام است زاں نمے طلبند | حرام عیشان، کیفِ حلال مے خواہند

جہانگیر نے مہربانی سے باتیں کرنی چاہیں، لیکن طالب پتھر کی تصویر تھا، دیانت خاں کو سخت ندامت ہوئی، طالب گھر پر واپس آیا تو اس کی معذرت میں فی البدیہہ، ۵ شعروں کا ایک قطعہ لکھ کر دیانت خاں کی خدمت میں بھیجا، مدح کے بعد جہاں سے اصل مطلب شروع کیا ہے اس موقع کے چند اشعار یہ ہیں،

چہ لطفہا کہ نمودی و مے نمائی نیز — بہر غریب و مسافر علی الخصوص بمن
نخست آں کہ چو در غربتم نظر کردی — بہ مہر بردی از خاطرم ہوائے وطن
چہارم آں کہ بہ بزم شہنشہم بردی — چو دل بہ پہلوی خود ساختی مرا مسکن
بباد شاہم سرگرم گفت و گو کردی — بمہر دیدہ مے خفاش را حریف سخن
تو آنچہ باید کردی۔ ولیک طالع شوم — بدستیاری گردون نفاق زد با من
بہ بست نطق مرا بخت بد وزاں بستن — کشود بر من، ہم دوست طعنہ ہم دشمن
کرا گمان کہ چو من استعارہ پردازی — بصد زبان فصاحت بیان شود الکن
کرا گمان کہ فتد رشتہ کلام مرا — چو تار زلف عروسان شکن بروے شکن
ازیں قیاس نما، غور کن، کہ قدرت کیست؟ — بیک دو لحظہ چنیں دو قطعہ ادا کردن
دو چیز مُہر زبان سخنوری گردید — مرا بہ بزم شہنشاہ خوش عیار سخن
یکے زبونی طالع کہ دایم از اثرش — بہر دیار قریبم بہ گونہ گونہ محن
دگر زیادتی نشئہ کہ نامش را — نمے توانم از شرم بر لب آوردن
ادا صریح کنم تا گمان مے نبری — چرا کہ شستہ ام از وے بہفت آب دہن
مفرحے زدہ بودم بہ قصد گفتن شعر — عروج نشئہ آں کرد ہر چہ کرد بمن
بہ بزم بادشہم زاں زبان نمے گردید — کہ گشتہ بود مرا خشک از زبان و دہن

سخن شناسا! پیش تو چوں بر آرم سر | کز انفعال سرم غوطہ خورد در گردن
نہ کردہ جرم مرا عفو کن بہ لطف عمیم | کہ خوش نماست خطائے نکردہ بخشیدن
من ارچہ بیگنہم بخت من گنہ گار است | گناہ بخت مرا لطف کن، بہ بخش بمن

اعتماد الدولہ نے طالب کو مُہرداری کی خدمت سپرد کی، یہ خدمت اگرچہ ایک معزز خدمت تھی، لیکن طالب شاعری کے سوا اور کسی کام کا نہ تھا، چونکہ بیدلی سے اس کام کو انجام دیتا تھا اس لئے ایسی بے عنوانیاں اس سے سرزد ہو جاتی تھیں، کہ اس کو شرمندہ ہونا پڑتا تھا، آخر اس نے ایک قصیدہ لکھ کر اعتماد الدولہ کی خدمت میں پیش کیا، اور اس خدمت سے مستعفی ہو گیا، قصیدے کے چند اشعار یہ ہیں،

دو زہر ست در ساغرم ہر دو قاتل | دو زخم است بر سینہ ام ہر دو کاری
یکے آنکہ بے خواہش نفس و کوشش | بر ویم شگفت ایں گل شرمساری
دگر آں کہ شد رنجہ یارے کہ با من | زدے مو بمو یش دم از دوستداری
نیم زاہل دیوان بدفتر چہ کارم | مرا شاعری زیبد و مے گساری
بمن خدمت مدح فرمودن اولے | کہ لبس عاشقم بر جواہر نثاری
نہ چسپد بر اہل سخن شغلِ دنیا | چو بر پیر میخانہ پرہیز گاری
ز شاعر ثنا سنجی آید نہ خدمت | کہ بلبل نواخوان بود نہ شکاری
خصوصاً چو من شاعرے کز تجرد | بہ روحانیان زیبدم ہم قطاری
منت بندۂ داغدار قدیمم | بخادم کنون مُہر خود مے سپاری
چو مہر تو دارم چہ حاجت بمُہرم | مرا مہر داری بہ از مُہرداری
حق ایں است اما ز جرمے کہ رفتہ | ہمہ انفعالم، ہمہ شرمساری

ہمیں خجلتم دور دار دز خدمت | چو ابلیس مجرم ز درگاہ باری
وگرنہ ہماں طالب حق شناسم | زسر تا قدم شوق خدمتگذاری

اعتماد الدولہ نے اس کی تقریب دربار شاہی میں کی، جہانگیر نے بلاکر زمرۂ شعرا میں داخل کیا، اور ۱۰۲۸ھ میں ملک الشعراے کا خطاب عنایت کیا، چنانچہ خود تزک میں لکھتا ہے،

دریں تاریخ طالب آملی بخطاب ملک الشعرائی خلعت امتیاز پوشیدہ اصل اُو از آمل ست، یک چندے بہ اعتماد الدولہ مے بود، چوں رتبۂ سخنش از ہمگنان درگذشت درسلک شعراے پائے تخت منتظم گشت، ایں چند بیت از وست،

اس کے بعد طالب کے چند اشعار نقل کئے ہیں، جو آگے مناسب موقع پر درج کئے جائیں گے،

جہانگیر کے دربار میں اس نے اخیر زندگی تک نہایت عزت و احترام سے بسر کی، صرف ایک موقع ایسا پیش آیا کہ کسی بات پر جہانگیر ناراض ہوگیا، اور طالب چند روز تک شرف حضور سے محروم رہا، ایک قصیدہ میں اس واقعہ کو نہایت لطیف پیرایہ میں ادا کیا ہے،

بہ نسبت گُہرم دادہ بودی از کف خویش | تراز جود زیانے چنیں ہزار افتاد
مجھ کو موتی سمجھ کر تو نے پھینک دیا تھا | سخاوت کی وجہ سے تونے ایسے نقصان بہت اٹھائے ہیں
چو روشدم ز کفت چرخم از ہوا بربود | بہ گرمئے کہ زبانم بزینہار افتاد
جب تو نے مجھ کو پھینک دیا، تو آسمان نے اٹھالیا | اس گرمجوشی کے ساتھ کہ خود میں پناہ مانگنے لگا،

یکے مقابل خورشید داشت آئینہ ام　　بدید کز عرقش موج بر عذار افتاد

تھوڑی دیر تک آسمان نے میرے آئینہ کو آفتاب کے سامنے رکھا　　اور دیکھا کہ آفتاب کے چہرے پر پسینہ آگیا

چو پیش مشعل مہ برد شب چراغ مرا　　بچہرہ گونہ کاہیش شمع وار افتاد

پھر چاند کے مشعل کے سامنے کیا،　　اس کا چہرہ شمع کی طرح زرد پڑگیا

ازیں نشاط نگر دست آسمان لرزید　　کہ باز در کفِ خاقان کامگار افتاد

اس خوشی سے آسمان کا ہاتھ کانپا　　اور دوبارہ میں بادشاہ کے ہاتھ میں آگرا

کنون برشتہ مہرش بدار کز تقدیر　　دو بار در کفت ایں دُرِّ شاہوار افتاد

اے بادشاہ! اب مجھ کو محبت کی لڑی میں پرولے　　کیونکہ دو دفعہ یہ موتی تیرے ہاتھ سے گرچکا،

طالب نے ۱۰۳۶ھ میں، یعنے جہانگیر کے مرنے سے ایک برس پہلے عین شباب میں وفات پائی،

اعزہ و اولاد | طالب کی ایک بہن تھی جس کا نام ستی النسا تھا، جس کو طالب ماں کی برابر سمجھتا تھا، اس کو طالب کے ساتھ اس قدر محبت تھی کہ صرف اس سے ملنے کے لئے ایران سے آگرہ میں آئی۔ طالب اس وقت جہانگیر کے ساتھ دورہ میں تھا، بہن سے ملنے کے لئے اجازت طلب کی اور یہ قطعہ لکھ کر پیش کیا،

صاحبا! ذرہ پرورا! عرضے　　بزبان سخن وراست مرا

پیر ہمشیرہ ایست غمخوارم　　کہ باو مہر مادر است مرا

چار دہ سال بلکہ بیش گذشت　　کز نظر دور منظر است مرا

دور گشتم زخدمتش بعراق　　وین گنہ جرم منکر است مرا

ادنیاورد تاب دوری من　　کہ بہ مادر برابر است مرا

آمدا ینک بہ اکرہ وز شوقش — دل طپان چوں کبوتر است مرا
مے کند دل بسوے او آہنگ — چو کنم شوق رہبر است مرا
گر شود رخصتِ زیارت او — بہ جہانے برابر است مرا

اس کی شادی نصیرای کاشی سے ہوئی تھی، جو میرزا صائب کے استاد مسیح کاشی کا حقیقی بھائی تھا، نصیرا کی وفات کے بعد، ستی النساء ممتاز محل زوجہ شاہجہان، کی پیش خدمت مقرر ہوئی، چونکہ نہایت قابل، خوش تقریر، اور خانہ داری کا خاص سلیقہ رکھتی تھی، اس کے ساتھ علم طب میں اس کو مہارت تھی، ممتاز محل نے اس کو مہرداری کی خدمت سپرد کی، فارسیت اور فن قرأت کی واقفیت کی وجہ سے جہاں آرا بیگم کی تعلیم بھی اس کے متعلق کی گئی، ممتاز محل کے مرنے کے بعد شاہجہان نے اس کو حرم شاہی کا صدر کل یعنی مدار المہام مقرر کر دیا،

طالب کے اولاد ذکور نہ تھی، دو لڑکیاں تھیں، ستی النسا نے ماں کی حیثیت سے پالا، بڑی کی شادی عاقل خاں، اور چھوٹی کی، ضیاء الدین خاں سے کی، ستی النسا چھوٹی لڑکی کو بہت چاہتی تھی، سنہ ۲۰ جلوس مطابق ۱۰۵۶ھ شاہجہانی میں اس نے بمقام لاہور وفات پائی، ستی النسا اس کے ماتم میں سوگ نشین ہوئی، شاہجہان نے خود اس کے پاس جاکر ماتم پرسی کی اور محل میں ساتھ لایا، لیکن ستی النسا کو ایسا سخت صدمہ پہنچا تھا کہ حرم سے واپس آکر اسی دن مر گئی، شاہجہان نے دس ہزار روپے تجہیز و تکفین کے لئے عطا کئے، اور حکم دیا کہ لاش محفوظ رکھی جائے، تاج محل کی قبر کے پچھم جانب جلوہ خانہ سے متصل تیس ہزار روپے کی لاگت سے مقبرہ کی تیاری کا حکم دیا، جو سال بھر میں بنکر تیار ہوا، کچھ اوپر ایک سال کے بعد لاہور سے لاش منگوا کر مقبرہ میں دفن کی اور مقبرہ کے اخراجات

کے لئے ایک گاؤں عطا کیا جس کی سالانہ آمدنی تیس ہزار روپے[1] تھی،

تیموریوں کی یہی شاہانہ قدردانیاں تھیں جنھوں نے ان کے آستانے کو دنیا کے اہل کمال کا قبلۂ حاجت بنادیا تھا،

عام حالات و اخلاق وعادات

عبد النبی فخر الزمانی جو تذکرہ میخانہ کا مصنف اور طالب آملی کا معاصر تھا، اس کے حالات میں لکھتا ہے،

آں بلبل دستان سرا، درہمان سال کہ سنہ ۱۰۲۰ھ بود بدار الخلافت آگرہ آمد این ضعیف را مرتبۂ اول در ہند دراں ایام باو ملاقات واقع شد جوانی دید، بہ انواع ہنر آراستہ، چناں خلیق و زود آشنا کہ دریں فن نیز عدیل نداشت در مثنوی خویش دو سہ بیت در دوست آشنائی خود بیان فرمودہ حقاکہ حالی اوست و دران تکلفے نہ کردہ، آں ابیات ایں ست،

کتب طے کردہ ام در دوستداری	یکے علامہ ام در علم یاری
سزد آنان کہ علم مہر دانند	دریں فنم وحید الدہر خوانند
نباشد بیوفائی در بساطم	وفا یک گل بود از اختلاطم

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ طالب نہایت دوست پرور، وفا شعار اور خوش اخلاق تھا، زمانہ کی ضرورتوں نے اگرچہ اُس سے دردر کی خاک چھنوائی، یہاں تک کہ شیدا نے اس کی ہجو میں کہا،

شب و روز مخدوم ما طالبا	پے جیفۂ دینوی در تگ است
مگر قول پیغمبرش یاد نیست	کہ دنیا است مردار طالب[2] سگ است

[1] یہ پوری تفصیل مآثر الامرا جلد دوم صفحہ (۷۹۱، ۷۹۲) میں ہے،

[2] الدنیا جیفۃ وطالبھا کلاب، کی طرف اشارہ ہے،

لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ فطرتاً غیور اور خود دار تھا، غازی خاں کے دربار میں پہنچکر اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ پھر کسی کے آگے کبھی ہاتھ نہ پھیلائے گا لیکن اس کی بدقسمتی تھی کہ غازی خاں جوانامرگ ہو گیا،

عبداللہ خاں ناظم گجرات نے اس کی قدردانی میں کمی نہیں کی، لیکن صحبت بےمیل تھی، عبداللہ خاں کو شعر و شاعری سے کچھ لگاؤ نہ تھا، اس لئے وہ طالب کی سرپرستی لازمۂ امارت کی حیثیت سے کرتا تھا، اور طالب اس کو پسند نہیں کرتا تھا، اعتمادالدولہ نے خود اسکو جہانگیر کے دربار میں پہنچایا، اور بہت سے چکر کھا کر اب وہ اصلی مرکز پر آیا،

طالب نے ہر موقع پر اپنی آن قایم رکھی، اعتمادالدولہ کے نام اس نے ایک منظوم خط لکھا ہے، اس میں لکھتا ہے کہ شاعری دو قسم کے لوگ اختیار کرتے ہیں، ایک وہ پست ہمت جو پیشہ کی حیثیت سے اس کام کو کرتے ہیں، دوسرے وہ عالی طبع جن کو فطرتاً خدا نے شاعر بنایا ہے،

دو صنف اند اہل طبیعت کہ ہر یک | ندارند باہم سر سازگاری
یکے را فرو مائگی کردہ شاعر | یکے را بزرگی و عالی تباری
یکے اضطراری است انشائے نظمش | یکے راست شغل سخن اختیاری
یکے را علوِ طبیعت بجائے | کہ دزدد، ثمر از سایۂ تاجداری
یکے آں چناں پست فطرت کہ بالد | بجو واز خطاب فصاحت شعاری
یکے را طمع گشتہ ہادی ایں راہ | یکے را جوانی و ہنگامہ داری

ان دونوں قسموں کی تفصیل لکھ کر پوچھتا ہے،

گدا شاعر و میرزا شاعری ہست | ندانم مرا بر چہ ہنجار داری

یعنی دو قسم کے شاعر ہوتے ہیں "گدا" اور "میرزا" فرمایئے آپ مجھ کو کس قسم میں شمار کرتے ہیں؟ پھر خود جواب دیتا ہے،

من از شاعری شکر للہ کہ دارم ۔۔۔ بہ بخت بلند تو امید داری
کہ گر، وہر یک دانہ یاقوت گردد ۔۔۔ درو بینم از چشم بے اعتباری
بہ گلزار معنے ہزار فصیحم ۔۔۔ بہ منصب چہ شد نیستم گر ہزاری
ز آزادگانم تعلق ندانم ۔۔۔ مرا نیست با اہل شیوہ کاری

جہانگیر نے ایک دفعہ نشہ کے ترنگ میں حکم دیدیا تھا کہ مقربان خاص ڈاڑھی ترشوا کر شریک صحبت ہوں، طالب نے اس حکم کی تعمیل سے سرتابی کی، اور گھر میں بیٹھ رہا پھر ایک قطعہ لکھ کر بھیجا جس میں غیر حاضری کی یہ معذرت کی،

تراشید گانند یک سر سپاہ ۔۔۔ کسے را چو من تبرہ پُر کاہ نیست
بہ بزمے کہ موے نہ گنجد درو ۔۔۔ شدن بادو گز ریش دلخواہ نیست
بہشت است بزم تو و در بہشت ۔۔۔ من نا تراشیدہ را راہ نیست

یعنی ایسی محفل میں جہاں ایک بال کی گنجائش نہیں، دو گز کی ڈاڑھی لے کر جانا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا، آپ کی محفل بہشت ہے، اور بہشت میں مجھ ناتراشیدہ کا گذر نہیں ہوسکتا، پھر ایک اور قطعہ لکھا،

سفر مے کنم صاحبا[1] ورنہ من ۔۔۔ چہ سر ورنہ گردن تراشید مے

---

[1] مولوی غلام علی آزاد نے خزانہ عامرہ میں لکھا ہی، کہ اکبر نے ہندوؤں کی طرح آتش پرستی، اور ریش تراشی اختیار کرلی تھی، جہانگیر نے بھی باپ کی تقلید کی، اور اسی حیثیت سے طالب کو بھی ڈاڑھی ترشوانے کا حکم دیا، لیکن جہانتک ہمکو معلوم ہے، اکبر اور جہانگیر کسی عزیز کے مرنیکے وقت داڑھی کا صفایا کراتے تھے (بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۶۵)

بناخن نہ از تیغ، از روے خویش | من ایں مشت سوزن تراشید مے
سرو ریش وابرو بروت ومژہ | برسم برہمن تراشید مے
ہر آں کو تراشید پیش از ہمہ | ازو بیشتر من تراشید مے
چو من راہیم خارج از رسم تو | کہ مو وقت رفتن نتراشید مے

منشی فیروز ۱۰۲۹ھ میں طالب سے ملا تھا، اس نے ملاقات کے جو واقعات لکھے ہیں ان سے طالب کی طرز زندگی کی دلچسپ باتیں معلوم ہوتی ہیں، اس لئے ہم اُس کا خلاصہ لکھتے ہیں،

۱۰۲۹ھ میں جب بادشاہ فتح پور میں آیا تو مجھ کو طالب کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا، تالاب کے کنارے ایک خیمہ تھا، طالب اس میں مقیم تھا میں گیا تو دیکھا کہ گویا اعتکاف میں ہے. سامنے دیوان کے اجزا ہیں مصافحہ ومعانقہ کے بعد پوچھا کیونکہ تشریف لانا ہوا، میں نے کہا آپ کے چند شعر سُنے تھے، اُن کو سُنکر ملاقات کا شوق ہوا، پوچھا کیا شعر تھے، میں نے یہ شعر پڑھے

ع لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی | ع مژہ در جہان نمے بینیم

جب یہ شعر پڑھا،

مُردم ز رشک چند بہ بینم کہ جام مے | لب بر لبش گذارد و قالب تہی کند

تو اُچھل پڑا، اُٹھ کر گلے لگایا. میرے ذوق سخن کی نہایت تعریف کی امیری

جس کو ہندی زبان میں بھدرا کہتے ہیں، دربار کے خوشامدی بھی اس موقع پر بادشاہ کی تقلید کرتے تھے، طالب کو بھی اسی موقع پر حکم ہوا ہوگا- ورنہ داڑھی ترشوانا تو خود ایرانیوں کا عام شعار تھا، جو آج بھی تمام ایران میں جاری ہے شیعہ لوگ ہندوستان میں بھی خشخاشی داڑھی رکھتے ہیں، طالب اس سے کیوں انکار کرتا،

کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا کمر بند کھول ڈالئے اور آرام سے تشریف رکھئے کہ ایک دو دن لطف سے گذریں،

عین اسی حالت میں ایک مغل آگیا، جس کے ہاتھ میں خاقانی کا دیوان تھا، اور طالب سے پڑھنا چاہتا تھا، طالب نے کہا آج معاف رکھو، مدت کے بعد ایک درد آشنا ملا ہے، اس سے لطف صحبت اُٹھائیں گے، لیکن مُغل کب مانتا تھا، دیوان کھول کر یہ قصیدہ پڑھنا شروع کیا،

در پردۂ دل آمد دامن کشان خیالش　　　جان شد خیال بازی در پردۂ وصالش

در مرکز مثلث بگرفته ربع مسکون　　　فریاد اوج مریخ از تیغ مہ صقالش

طالب نے اس شعر کے معنے بیان کئے تو چونکہ علمی استعداد نہ تھی، اناپ شناپ باتیں کہنی شروع کیں۔ مجھ کو بے اختیار ہنسی آگئی، طالب نے جھلّاکر کہا کہ اس قسم کے اشعار کو تم لوگ ہندوستان میں درس کے قابل سمجھتے ہو، میں ایسے شعر ناخن پاسے رکھتا ہوں، میں نے کہا شاعری اور چیز ہے اور سخن فہمی اور چیز، طالب مکدّر ہوکر چُپ ہو گیا، مجھ کو بھی ملال ہوا کہ ناحق میں نے اس کا دل دکھایا، اُس کے خوش کرنے کو میں نے اور سلسلہ چھیڑ دیا، اور کہا کہ کل دربار میں آپ کے کس شعر پر لوگ معترض تھے، طالب نے کہا یہ شعر تھا،

عنبر افسردہ ام در پردہ دارم بوے خوش

اس پر آصف خاں نے اعتراض کیا کہ عنبر کو افسردہ نہیں کہہ سکتے، اوروں نے بھی اس کی تصدیق کی، میں نے کہا کہ خاقانی نے پتھر کو افسردہ کہا ہے

پھر عنبر نے کیا قصور کیا ہے، خاقانی کا شعر یہ ہے،

کز فیض او بہ سنگ فسردہ رسد نما

طالب نہایت خوش ہوا، اور مجھ سے کہا کہ اس شعر کو ایک پرچہ پر لکھ دیجئے[1]

شاعری | اس امر میں طالب تمام شعرا سے ممتاز ہے کہ وہ فطرتاً شاعر تھا، یعنے جب نہایت کم سن تھا، اسوقت سے شعر کہتا تھا، ایک قصیدہ جو کلیات میں موجود ہے، اس وقت کا ہے جب تقریباً اس کی عمر ۱۲-۱۳ برس کی تھی، خود اس بات پر فخر کرتا ہے، اور کہتا ہے،

غیر کلاک من نشان ندہد کسو کز آب شعر دفتر اسلاف شوید کودک دہ ویر یر

یعنے میرے قلم کے سوا اس کی کوئی مثال نہیں مل سکتی، کہ کل کا لونڈا پچھلوں کے کارناموں پر پانی پھیر دے،

وہ نہایت جلد شعر کہہ سکتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ اُس نے قلم ہاتھ میں لیا اور بے تکلف لکھتا گیا، دو تین گھنٹے میں ۵۰، ۶۰، شعروں کا قصیدہ تیار ہو گیا، قلیچ خاں ناظم لاہور کی شان میں ۸۴ شعروں کا قصیدہ ایک رات میں لکھا، چنانچہ خود کہتا ہے،

منم کہ نیست چو من شاعرے ز اہل سخن منم کہ نیست چو من قابلے ز اہل کلام

گواہ ایں دو سہ معنی، ہمیں قصیدہ بس است کہ یافت از سر شب تا سپیدہ دم اتمام

جہانگیر کی مدح میں اس کا ایک بڑا پر زور قصیدہ ہے جس میں ۵۰، ۶۰ شعر ہیں،

چو شہسوار مرا چشم بر شکار افتاد بزخم تیر نگہ، صید بے شمار افتاد

یہ بھی صرف رات بھر کی کمائی ہے، چنانچہ خود کہتا ہے،

بہ خامہ دستیم اے شہریار خردہ مگیر کہ یک شب ایں ہمہ نقشم بروے کار افتاد

---

[1] تذکرہ شعرا از احمد علی سندیلوی ذکر طالب آملی،

پہلی دفعہ جہانگیر کے دربار میں ناکامی کے بعد جو قطعہ دیانت خاں کو لکھا تھا، وہ بھی بالکل قلم برداشتہ تھا، خود کہتا ہے،

ازیں قیاس نما غور کن کہ قدرت کیست — بیک دو لحظہ چنیں قطعۂ ادا کردن

شاعری میں طالب کا امتیازی وصف صرف دو چیزیں ہیں، ندرتِ تشبیہ، لطفِ استعارہ، استعارات کی نزاکت اس کے دور سے پہلے شروع ہو چکی تھی، لیکن اس نے اور زیادہ لطافت اور ندرت پیدا کر دی، اس کا کلام کہیں سے اٹھا کر دیکھو، ہر جگہ نئے نئے استعارے نظر آئیں گے، ان میں سے اکثر لطیف اور نازک ہیں، اور بعض بعض معماسازی اور جھوٹے طلسم ہیں،

اس موقع پر ہم اس کے چند منتخب اشعار درج کرتے ہیں، ان میں ابتدا کے چار شعر وہ ہیں جو جہانگیر نے تزک جہانگیری میں ملک الشعرائی کے خطاب دینے کے وقت انتخاباً درج کئے ہیں، باقی مرزا صائب کے انتخاب ہیں،

لب از گفتن چناں بستم کہ گوئی — دہن بر چہرہ زخمے بود و بہ شد

عشق در اول و آخر ہمہ وجد است و سماع — ایں شرابیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

دو لب خواہم یکے در مے پرستی — یکے در عذر خواہی ہائے مستی

زغارت چمنت بر بہار منت ہاست — کہ گل بہ دست تو از شاخ تازہ تر ماند

دشنام خلق راندہم جز دعا جواب — ابرم کہ تلخ گیرم و شیریں عوض دہم

بے نیازانہ ز ارباب کرم مے گذرم — چوں سیہ چشم کہ بر سرمہ فروشاں گذرد

مرد بے مرگ و نوا را سبک از جائے بگیر — کوزہ بے دستہ چو بینی بدو دستش بردار

مزۂ در جہان نمے بینم — دہر گوئی دہان بیمار است

نظارۂ ترا دو جهان جز دو چشم نیست　　یک چشم باز مانده و یک چشم برہم است

خانه شرع خراب است که ارباب صلاح　　در عمارت گری گنبد دستار خودند

ما را زبان شکوه ز بیداد چرخ نیست　　از ما خطے بمہر خموشی گرفته اند

درین انجمن غیر لبہاے یار　　دو مے را بیک نشئه کم دیده ام

باصد کرشمه آن بت بدمست مے رود

خود مے کند خرام و خود از دست مے رود

میرزا صائب اصفہانی

ایران کی شاعری رودکی سے شروع ہوئی اور میرزا صائب پر ختم ہوگئی، رودکی سے پہلے بھی شعرا گذرے ہیں، اور میرزا صائب کے بعد بھی لوگوں نے طبع آزمائیاں کیں، لیکن یہ دونوں دور شمار کے قابل نہیں، اخیر دور میں قاآنی بے شبہ ایسا شخص پیدا ہوا جس نے دفعتہً شاعری کی کایا پلٹ کردی، لیکن اُس کی شاعری کوئی نئی شاعری نہیں، بلکہ اس نے سات سو برس کے بھولے ہوئے خواب کو یاد دلایا اور یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ فرخی اور منوچہری نے قاآنی کا قالب اختیار کرلیا،

شاعری ابتدا سے جس انداز پر چلی آتی تھی، اکبری اور صفوی دور نے دفعتاً اُس کی روش بدل دی، عرفی، نظیری، وحشی یزدی، شفائی نے ہزاروں گوناگون خیالات پیدا کرکے شاعری کے میدان کو نہایت وسیع کردیا، بالخصوص عشق وعاشقی کے رموز واسرار اور فلسفہ زندگی کے ایسے سینکڑوں ہزاروں نکتے بیان کئے، جو قدما کے خواب وخیال میں بھی نہ آئے تھے لیکن یہ جو کچھ تھا، اکبر وعباس صفوی کا فیض تھا، جہانگیر وشاہجہان نے شاہجہانہ فیاضیاں اکبر سے بھی زیادہ دکھائیں، لیکن تمام پُرزور قوتیں کام میں آچکی تھیں، جہانگیر اور شاہجہان کے لئے فطرت کی فیاضی کا بہت کم سرمایہ رہ گیا تھا، اس عہد میں بھی جو کچھ ہوا وہ اکبرہی کی تحریک دادہ قوت تھی، قدسی، طالب آملی، طالب کلیم، گو جہانگیری وشاہجہانی شعرا ہیں لیکن یہ بھی اکبرہی کے نہال فیض کے برگ وبار ہیں،

میرزا صائب بھی اسی عہد کے یادگار ہیں، اور سچ یہ ہے کہ کلیم کے سوا اس

دور میں کوئی شخص اُس کی ہمسری کا دعوے نہیں کرسکتا، اور اس کے بعد تو عالمگیر کے زہد خشک نے شاعری کا چراغ ہی گل کردیا،

صائب ایک معزز خاندان کا آدمی تھا، اس کا باپ مشہور تاجر تھا، اس کی ولادت تبریز میں[1] ہوئی، لیکن نشوونما اور تعلیم و تربیت اصفہان میں حاصل کی، اسی بنا پر اس کو تبریزی اور اصفہانی دونوں کہتے ہیں، شعر و شاعری سے اس کو قدرتی مناسبت تھی، آغاز سن شعور میں جب اس کی شاعری کے چرچے ہونے لگے تو ایک شخص نے امتحان کے طور پر ایک مہمل مصرع پیش کیا کہ اُس پر مصرع لگا دیجئے، مصرع یہ تھا،

شمع گر خاموش باشد، آتش از مینا گرفت

صائب نے پیش مصرع کہہ کر مصرع کو بامعنی کردیا[2]

امشب از ساقی ز بس گرم ست محفل، میتوان — شمع گر خاموش باشد، آتش از مینا گرفت

یعنی آج محفل ایسی گرم ہے کہ اگر شمع بجھ جائے تو بوتل سے آگ روشن کرلی جاسکتی ہے،

باوجود شاعری کے صائب پر مذہبی خیالات بہت غالب تھے، آغاز شباب میں حرمین کا سفر کیا، واپسی کے بعد مشہد مبارک کی زیارت کی، اور اظہار عقیدت کے طور پر ایک قصیدہ لکھا، جس کا ایک شعر یہ تھا،

بللہ الحمد کہ بعد از سفر حج صائب — عہد خود تازہ بسلطان خراسان کردم

صائب نے شاعری کی باقاعدہ تعلیم، حکیم رکنا مسیح کاشی، اور حکیم شفائی سے حاصل کی، حکیم رکنا مشہور شاعر گذرا ہے، شاہ عباس صفوی اُس کے گھر پر اُس سے ملنے آتا

---

[1] آتشکدہ میں لکھا ہے کہ اس کے خاندان کو عباس صفوی نے اصفہان میں لے جاکر آباد کرایا تھا، اور صائب یہیں پیدا ہوا، [2] ید بیضا،

تھا، شاہ عباس کو حاسدوں نے اُس کی طرف سے رنجیدہ کردیا، تو حکیم رکنا نے دربار سے قطع تعلق کیا، اور یہ مطلع لکھا،

گر فلک، یک صبحدم بامن گراں باشد سرش شام بیروں میروم چوں آفتاب از کشورش

اس کے بعد ہندوستان چلا آیا اور اکبر و جہانگیر کے دربار میں رسائی پائی، شاہجہان جب تخت پر بیٹھا تو قطعہ تاریخ لکھ کر بارہ ہزار روپے صلے میں حاصل کئے، ۱۰۴۱ھ میں مشہد مقدس کی زیارت کی اجازت لی، شاہجہان نے زاد سفر کے لئے پانچ ہزار روپے عنایت کئے، ۱۰۶۶ھ میں انتقال کیا،

ہندوستان کی فیاضیوں کے غلغلہ سے تمام ایران گونج رہا تھا، صائب کے دل میں بھی تحریک پیدا ہوئی، چنانچہ خود کہتا ہے،

ہمچو عزم سفر ہند، کہ در ہر دل ہست رقص سودائے تو در ہیچ سرے نیست کہ نیست

زاد سفر کے لئے اگرچہ شاعری سے بہتر کوئی چیز نہ تھی، لیکن صائب چونکہ ایک معزز تاجر کے گھر میں پیدا ہوا تھا، اُس نے یہ مبتذل طریقہ پسند نہ کیا، اور تجارت کے ذریعہ سے دلّی میں آیا، شاہجہان کے دربار میں رسائی حاصل کی اور ہزاری منصب اور مستعد خاں خطاب عطا ہوا، یہیں ظفر خاں سے ملاقات ہوئی۔ اور اس قدر تعلقات بڑھے کہ صائب اور ظفر خاں کا نام ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے[1]،

ظفر خاں مشہور اُمرائے تیموری میں سے ہے، اس کا باپ خواجہ ابوالحسن اکبر کے زمانے میں ایران سے آکر دکن کا دیوان مقرر ہوا تھا، جہانگیر نے اپنے زمانے میں وزیر اعظم

[1] صائب کے سفر ہندوستان کے متعلق نہایت مختلف و متناقض روایتیں ہیں، ہم نے سرو آزاد، ید بیضا، ریاض الشعرا کو چھوڑ کر مرآۃ الخیال کی روایت اس لئے اختیار کی ہے، کہ اسکا مصنف صائب کا گویا ہمعصر تھا،

مقرر کیا ۱۰۳۳ھ میں وزارت کے ساتھ کابل کی حکومت بھی عطا کی، لیکن چونکہ وزارت کے تعلق سے پایۂ تخت سے جدا نہیں ہو سکتا تھا، اس کے بیٹے ظفر خاں کو باپ کی قائم مقامی کے طور پر کابل کی حکومت ملی، ظفر خاں نہایت فیاض اور قدر دان علم و فن تھا، خود بھی شعر کہتا تھا، اور احسن تخلص کرتا تھا، مرزا صائب کی شاگردی نے اس کی استعداد کو اور ترقی دی، چنانچہ خود کہتا ہے،

طرز یاران، پیش احسن بعد ازیں مقبول نیست
تازہ گوئیہا مے او، از فیض طبع صائب است

مرزا صائب نے ظفر خاں کی مدح میں متعدد قصائد لکھے، اور چونکہ ممدوح درحقیقت مدح و ثنا کا سزا وار تھا، میرزا کو اس کی مدّاحی پر ناز تھا، ایک قصیدہ میں لکھتا ہے،

کلاہ گوشہ بخورشید و ماہ مے شکنم
برایں غرور کہ مدحت گر ظفر خانم

ز نو بہار سخایش، چو قطرہ ریزہ شبنم
قسم خورد بسر کلک، ابر نیسانم

بلند بخت نہالا! بہار تربیتا!
کہ از نسیم ہوا داریت، گلستانم

حقوق تربیتت را، کہ در ترقی باد
زبان کجاست؟ کہ در حضرتت فرو خوانم

تو پایۂ تخت سخن را بدست من دادی
تو تاج مدح نہادی، بفرق دیوانم

ز روے گرم تو چو شید، خون معنی من
کشید جذب تو، ایں لعل از رگ کانم

تو جان، ز دخل بجا، مصرع مرا دادی
تو در فصاحت، دادی خطاب سحبانم

ز دقت تو بمعنی شدم چناں باریک
کہ مے توان بدل مور، کرد پنہانم

چو زلف سنبل ابیات من پریشاں بود
نداشت طرۂ شیرازہ روے دیوانم

تو غنچہ ساختی اوراق باد بردۂ من[۱]
وگرنہ خارنمے ماند از گلستانم

---

[۱] ید بیضا و سرو آزاد، بلگرامی،

ان اشعار سے ثابت ہوتا ہے کہ میرزا صائب نے اپنے دیوان کو ظفر خاں کی فرمایش سے مرتب کیا تھا، ان اشعار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ظفر خاں میرزا صائب کے کلام پر استادانہ نکتہ چینیاں کرتا تھا، اور اس قسم کی روک ٹوک سے میرزا کا کلام اور زیادہ ترقی کرتا جاتا تھا،

سنہ ۱۰۳۹ ہجری میں شاہجہان نے دکن کا رُخ کیا، ظفر خاں بھی اس سفر میں ہمرکاب تھا، اور میرزا صائب اس کے ساتھ تھا۔ جب برہانپور میں پہنچا تو چونکہ یہاں کی زمین نہایت غبار انگیز تھی میرزا صائب نے کہا،

توتیا سازد غبار آگرہ و لاہور را　　چشم من تا خاکمال گرد برہانپور خورد

صائب کے باپ کو صائب سے نہایت محبت تھی، اس زمانے میں ہندوستان کا سفر ایک معمولی بات تھی، اور ایران اور ہندوستان ایک مکان کے دو صحن بن گئے تھے، تاہم محبت کا یہ جوش تھا، کہ میرزا کے باپ نے ستر برس کی عمر میں ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور پیارے بیٹے کو ساتھ لے جانا چاہا، میرزا صائب کو مجبوراً ظفر خاں سے رخصت کی استدعا کرنی پڑی ایک مدحیہ قصیدہ لکھا اور اس میں اس طرح اظہار مطلب کیا،

شش سال بیش رفت کہ از اصفہان بہند　　افتادہ است توسنِ عزم مرا گذار
آوردہ است جذبۂ گستاخ شوق من　　از اصفہان بہ آگرہ و لاہورش اشکبار
ہفتاد سالہ، والد پیرست بندہ را　　کز تربیت بود بمنش حقِ بے شمار
زاں پیشتر کز آگرہ بہ معمورۂ دکن　　آید عنان گسستہ تر، از سیل بے قرار
ایں راہ دور را از سر شوق، طے کند　　با قامتِ خمیدہ، و با پیکرِ نزار
دارم امید رخصتے، از آستانِ تو　　اے آستانت، کعبۂ امیدِ روزگار

مقصود اُو ز آمدنش بُردنِ من ست — لب را بحرف رخصتِ من کُن گہر نثار

با جبہۂ[1] کشادہ تر از آفتاب صبح — دست دعا بہ بدرقۂ راہِ من بر آر

حُسن اتفاق یہ کہ اسی زمانہ میں یعنے ۱۰۴۱ سنہ ہجری میں شاہجہان نے دکن سے آگرہ کا قصد کیا اور آغاز ۱۰۴۲ سنہ میں ظفر خاں کشمیر کی صوبہ داری پر ممتاز ہوا، میرزا صائب ظفر خاں کے ساتھ کشمیر میں آیا اور اس بہشت برین کی سیر کر کے باپ کے ساتھ وطن کو واپس گیا، ایران میں ایسے جوہر قابل کے لئے قدردانی کی کیا کمی تھی، سلاطین صفویہ نے بڑی عزت و احترام سے لیا، میرزا نے بھی اُن کی مدح میں پُر زور قصائد لکھے، شاہ عباس ثانی نے اس کو ملک الشعراء کا خطاب دیا، لیکن جب اس کے بعد سلیمان صفوی تخت نشین ہوا، اور میرزا صائب نے قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس کا مطلع یہ تھا،

احاطہ کرد خط آں آفتاب تابان را — گرفت خیل پری، در میان سلیمان را

تو سلیمان صفوی چونکہ نوخیز اور نوخط تھا، نہایت رنجیدہ ہوا، اور پھر تمام عمر میرزا سے خطاب نہ کیا،[1]

میرزا نے اگرچہ اخیر زندگی تک ایران سے قدم باہر نہیں نکالا تاہم ہندوستان کی فیاضیاں رہ رہ کر یاد آتی تھیں، جب نواب جعفر خاں آغاز عہد عالمگیری میں وزیر اعظم مقرر ہوا تو میرزا نے یہ شعر لکھ کر بھیجا،

دور دستان را باحسان یاد کردن ہمت ست — ورنہ ہر نخلے بپائے خود ثمر مے افگند

جعفر خاں نے پانچ ہزار روپیہ اور بقول بعض پانچہزار اشرفیاں بھیجیں،[2]

۱۰۸۰ سنہ ہجری میں بمقام اصفہان وفات پائی "صائب وفات یافت" مادہ تاریخ ہے،

---

[1] ریاض الشعراء [2] خزانہ عامرہ،

میرزا کا ایک مطلع ہے،

در ہیچ پردہ نیست، نباشد نوائے تو | عالم پرست از تو و خالی ست جائے تو

میرزا نے وصیت کی تھی، کہ یہ مطلع اس کے مزار پر کندہ کیا جائے، چنانچہ سنگ مرمر کے لوح پر کندہ کیا گیا،

عام حالات وعادات مرزا نہایت خوددار، پابند وضع، پاکیزہ خو، اور منکسر المزاج تھا شعرائے ایران کی عام عادت ہے کہ ہندوستانی شعرا کو مطلق خاطر میں نہیں لاتے، امیر خسرو اور حسن کے سوا، کسی ایرانی مستند شاعر نے کبھی کسی ہندوستانی شاعر کا نام نہیں لیا، لیکن میرزا صائب اپنے ہمعصر ہندوستانیوں کا نام بھی، غزل کے مقطعوں میں لاتا ہے، اور ان کی غزلوں پر غزل لکھنا گوارا کرتا ہے، ایک غزل غنی کے جواب میں لکھی ہے، اس کا مقطع یہ ہے،

ایں جواب آں غزل صائب کہ میگوید غنی | یاد ایامیکہ دیگ شوق ما سرپوش داشت

میرزا کی عادت ہے کہ اکثر شعرا کی غزلوں پر غزل لکھتا ہے اور مقطع میں ان شعرا کے غزلوں کے پورے مصرع نقل کر دیتا ہے، اس سے اس کی صحت مذاق اور خوبی انتخاب کا اندازہ ہو سکتا ہے،

ایں آں غزل کہ فیضی شیریں کلام گفت | "در دیدہ ام خلیدہ و در دل نشستہ"

ایں جواب آں غزل صائب کہ مے گوید ملک | "چشم بینش باز کن، تا ہر چہ خواہی بنگری"

بطرز تازہ قسم یاد مے کنم صائب | کہ جائے طالب آمل در اصفہان پیدا است

ایں جواب مصرع نوعی کہ خاکش سبز باد | "سایہ ابر بہاری کشت را سیراب کرد"

ایں آں غزل کہ اوحدی خوش کلام گفت | "اے روشن اندر رخ تو زمین و زماں ہمہ"

جواب آں غزل ست اینکہ میر شوقی گفت | چو شیر از دو طرف مے کشند زنجیرم"
این جواب آں غزل صائب کہ فتحی گفتہ است | از فراموشاں مباد، آنکس کہ مارا یاد کرد
صائب این تازہ غزل آں غزل شاپور ست | "کہ گراں مے رود آں کس کہ توکل دارد"
جواب آں غزل ست اینکہ گفتہ است مطیع | "کلید کعبہ و بُت خانہ در بغل دارم"
این جواب مصرع اوجی کہ وقتی گفتہ است | بادشاہی عالم طفلی ست یا دیوانگی"
این جواب آں غزل صائب کہ اوہم گفتہ است | "گر منش دامن نگیرم خون من خود مردہ نیست"
جواب آں غزل حاذق ست این صائب | "بہار دیدم وگل دیدم و خزاں دیدم"
این جواب آں غزل صائب کہ راقم گفتہ است | "تیغ دایم آب در جو دارد و خون مے خورد"

شعرا میں ہمیشہ باہم رقابت اور حسد ہوتی ہے لیکن میرزا صائب اس کو نہایت ناپسند کرتا تھا، چنانچہ ایک نظم میں باہمی محبت اور اعانت کی ترغیب دی[1] ہے،

خوش آں گروہ کہ مست بیان یکدگر اند | ز جوش فکر مئے ارغوان یک دگر اند
نہ زنند بسنگ شکست، گوہر ہم | پے رواج متاع دُکان یک دگر اند
زنند بر سر ہم، گل ز مصرع رنگین | ز فکر تازہ، گل بوستان یک دگر اند
سخن تراش چو گردند، تیغ الماسند | زنند چو طبع بکندی، فسان یک دگر اند
بغیر صائب و معصوم نکتہ سنج و کلیم | وگر کہ ز اہل سخن مہربان یک دگر اند

صائب اگرچہ تمام اساتذہ بلکہ ہمعصروں کو ادب سے یاد کرتا تھا، لیکن خاص خاص اساتذہ کا نہایت معتقد تھا، سب سے زیادہ خواجہ حافظ کا معترف تھا اور یہ اس کی صحیح المذاقی کی بہت بڑی دلیل ہے، لوگوں کے اصرار سے ایک غزل خواجہ حافظ کی غزل

[1] سرو آزاد، ذکر معصوم شاعر،

پر لکھی، لیکن مقطع میں یہ عذر کیا،

صائب چہ تواں کرد بہ تکلیف عزیزاں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ورنہ طرفِ خواجہ شدن بے بصری بود

ایک اور غزل میں کہتا ہے،

رواست صائب اگر نیست از رہِ دعوے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تتبّع غزل خواجہ گرچہ بے ادبی ست

حکیم رکنا اور شفائی کا شاگرد تھا، اس لئے ان دونوں کا نام نہایت ادب سے لیتا ہے،

ایں آں غزل حضرت رکناست کہ فرمود ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ "پائے ملخے پیش سلیمان چہ نماید"

در اصفہان کہ بدردِ سخن رسد، صائب! ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کنوں کہ نبض شناس سخن شفائی نیست

نظیری کو عرفی سے زیادہ مانتا تھا، چنانچہ کہتا ہے،

صائب چہ خیال ست شوی ہمچو نظیری ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ عرفی بہ نظیری نہ رسانید سخن را

یہاں تک مضایقہ نہیں، لیکن افسوس ہے کہ عام خوش اعتقادی یا شہرت عام کی بنا پر ظہوری اور جلال اسیر کی بھی مداحی کرتا ہے،

صائب نداشتیم سر و برگ ایں غزل ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ایں فیض از کلام ظہوری بما رسید

خوشا کسے کہ چو صائب ز صاحبان کمال ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ تتبع غزل میرزا جلال کند

بدمذاقی کا یہ پہلا قدم تھا، جس نے آخر ایک شاہراہ قائم کر دی، اور نوبت یہ پہنچی، کہ آج لوگ ناصر علی، بیدل، شوکت بخاری وغیرہ کے کلام پر سر دُھنتے ہیں، "بنیاد ظلم در جہان اندک بود، ہر کہ آمد براں مزید کرد،

میرزا صائب نے ہر قسم کی اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، قصائد متعدد ہیں، ایک چھوٹی سی رزمیہ مثنوی بھی ہے، اور غزل تو اس کا خاص فن ہے، لیکن قصائد اور مثنویاں کم رتبہ ہیں، یہ دونوں چیزیں اس دور سے پہلے ابتر ہو چکی تھیں، اور مرزا بھی اس

کی کچھ تلافی نہ کرسکا، رزمیہ مثنوی کا ایک شعر یاد رکھنے کے قابل ہے،

چناں لرزہ در دشت کین اوفتاد　　　　که قارون برون از زمین اوفتاد

میرزا نہایت پُر گو، اور بدیہہ گو تھا، جس زمانے میں وہ برہانپور دکن میں تھا، ایک قصیدہ ساٹھ شعروں کا صرف دو پہر میں لکھا، اس قادر الکلامی کے نشہ میں خود کہتا ہے

ہزار حیف کہ عرفی و نوعی و سنجر　　　　نیند جمع بدار العیار برہان پور

کہ قوتِ سخن و لطف طبع مے دیدند　　　　نمے شدند بطبع بلند خود مغرور

ہمیں قصیدہ کہ یک چاشت روے داد مرا　　　　ز اہل نظم کہ گفت ست؟ در سنین و شہور

ایک دفعہ اس کے ایک شاگرد نے ایک مہمل مصرع پیش کیا کہ اس پر مصرع لگا دیجئے، مصرع یہ تھا،

از شیشۂ بے مے، مئے بے شیشہ طلب کن

صائب نے فوراً کہا،

حق را ز دلِ خالی از اندیشہ طلب کن

ایک دفعہ راہ میں چلا جا رہا تھا، ایک کُتے کو بیٹھا ہوا دیکھا، چونکہ کُتا جب بیٹھتا ہے تو گردن اونچی کرکے بیٹھتا ہے، فوراً یہ مضمون خیال میں آیا[۱]

شود ز گوشہ نشینی فزوں رعونت نفس　　　　سگِ نشستہ ز استادہ سرفراز تر ست

فغانی کا مشہور مطلع ہے،

بہ بوئیت صبحدم نالاں بگلگشت چمن رفتم　　　　نہادم روے بر روے گل و از خویشتن رفتم

میرزا نے اس کو یوں بدل دیا،[۲]

۱؎ کلمات الشعراء سرخوش، ۲؎ کلمات الشعراء،

بوئے صبحدم گریاں چو شبنم در چمن رفتم　　نهادم رو بہ پائے گل واز خویشتن رفتم

شبنم کی تشبیہ نے شعر میں جان ڈال دی اور دعوے کو پورا ثابت کر دیا۔

میرزا خاضع، میرزا صائب کے شاگرد اور سید عبدالجلیل بلگرامی کے ہمنشین تھے، ان کی زبانی منقول ہے کہ ایک دفعہ میں نے میرزا صائب کے سامنے یہ مصرع پڑھا۔ ع

دویدن، رفتن، استادن، نشستن، خفتن و مردن،

مصرع بالکل مہمل تھا، یعنی چند چیزیں بے مناسبت جمع کر دی تھیں، میرزا نے پیش مصرع لگا کر عجیب فلسفیانہ مضمون پیدا کر دیا،[۱]

بقدر ہر سکون راحت بود، بنگر تفاوت را　　دویدن رفتن استادن نشستن خفتن و مردن

میرزا کی زندگی ہی میں اس کے کلام کو یہ حُسن قبول حاصل ہو چکا تھا، کہ سلاطین اور امراء، شاہ ایران سے اس کے کلام کی استدعا کرتے تھے اور تحفہ اور سوغات کی طرح اس کی غزلیں بھیجی جاتی تھیں[۲]،

میرزا نے فن سخن کے متعلق ایک بڑا کام یہ کیا، کہ قدما اور متاخرین کا کلام انتخاب کر کے ایک بیاض مرتب کی جو سخندانوں کے لئے دلیل راہ کا کام دیتی ہے، میرزا کا اپنا انداز گو خاص ہے اور وہ شاعری کا معمولی درجہ ہے، لیکن چونکہ اس کا مذاق نہایت صحیح تھا، اس لئے بلند اور نادر اشعار انتخاب کئے ہیں، شعرائے عرب میں ابو تمام ایک مشہور شاعر گذرا ہے جو متنبی کا ہم پلہ خیال کیا جاتا ہے، اس نے ایک مجموعہ انتخاب کیا تھا جو حماسہ کے نام سے مشہور ہے اور فن ادب کی جان ہے، اہل فن کا بیان ہے کہ ابو تمام کی شاعری کا کمال جس قدر اس انتخاب سے معلوم ہوتا ہے، خود اس کے دیوان سے ظاہر نہیں ہوتا،

[۱] ید بیضا [۲] کلمات الشعرا سرخوش،

میرزا صائب کے انتخاب کا بھی بعینہ یہی حال ہے، جس شاعر کے جتنے اشعار انتخاب کر دیئے ہیں، وہی اُس کے تمام دیوان کا عطر ہے،

میں نے اس کتاب کا ایک نسخہ حیدر آباد میں دیکھا تھا، جو خود میرزا کے ایک شوقین شاگرد نے ایران میں نہایت اہتمام سے طیار کرایا تھا، ہر شاعر کے نام کے ساتھ اس کے اشعار کی تعداد بھی ہندسوں میں لکھدی ہے، اخیر میں مختصر سی عبارت ہے، جس میں انتخاب کا حال لکھا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اہل فن اس بیاض کی نقلیں لیتے تھے، اور اس سے فائدہ اُٹھاتے تھے **والہ داغستانی** نے ریاض الشعرا میں جابجا اس کے حوالے دیئے ہیں، میں نے اس بیاض کے تین نسخے دیکھے ہیں، جن میں سے ایک خود میرے کتب خانے میں موجود ہے،

میرزا کے لطائف وظرائف بہت مشہور ہیں، جس زمانے میں وہ کشمیر میں تھا، ایک دن ظفر خاں کے دربار میں اشعار پڑھ رہا تھا، اور ہر طرف سے تحسین وآفرین کی صدا بلند تھی، ایک نوخیز نے حسد سے کہا کہ یہ تمام مضامین قدماء کے یہاں بندھ چکے ہیں، موجودہ شاعروں کا یہ کام رہ گیا ہے کہ صرف لفظوں کو اُلٹ پُلٹ کر دیتے ہیں، صائب نے برجستہ کہا،

اہل دانش، جملہ مضمونہاے رنگین بستہ اند   ہست مضمون نہ بستہ ..... شما

چونکہ اتفاقاً شعر حسب حال تھا ظفر خاں بے اختیار ہنس پڑا اور میرزا کو انعام دیا، میرزا نے ایک غزل لکھی تھی جس کا مطلع تھا،

سروِ من طرح نو انداختۂ یعنی چہ   جامہ را فاختہ ساختۂ، یعنی چہ

ایک مولوی صاحب نے سنا تو فرمایا کہ ردیف غلط ہے، یعنے چہ غائب کا صیغہ ہے اور مخاطب کے لئے استعمال کیا گیا ہے، میرزا کے سامنے کسی نے تذکرہ کیا، اُس نے کہا

شعر مرا بمدرسہ کہ بُرد،

ایک صاحب محمد مراد متخلص بہ لائق جونپور کے رہنے والے تھے، عالمگیر کے زمانے میں لاہور کی سوانح نگاری پر مامور تھے، آغاز شباب میں ان کو شاعری کا شوق پیدا ہوا، میرزا صائب کی شہرت سُن کر ایران کا قصد کیا، اور جوش اعتقاد میں جونپور سے اصفہان تک پاپیادہ گئے، میرزا نے بھی ان کے خلوص و ارادت کی بڑی قدر کی، خود اپنے گھر میں مہمان اُتارا اور ہر طرح کی مہمان نوازی کی، اُن کا بیان ہے کہ میں نے کبھی مرزا کو شعر کے لئے غور و فکر کرتے نہیں دیکھا، لیکن ایک دن خلاف عادت باغ کی روشوں پر متفکرانہ ٹہل رہے تھے، میں نے سبب پوچھا فرمایا کہ فردوسی کا مشہور شعر ہے،

بفرمود تا رخش را زیں کنند ۔۔۔ دُم اندر دُم نائے زریں کنند

شفائی نے اس شعر کا جواب لکھا ہے،

بفرمود تا زین بر ابرش نہند ۔۔۔ چو زین ہمہ بالائے آتش نہند

میں بھی اس کا جواب لکھنا چاہتا ہوں، انہوں نے کہا کہ اجازت ہو تو میں اس کام کو انجام دوں، تمام رات کی غور و فکر کے بعد صبح کو یہ شعر لکھ کر میرزا کی خدمت میں[1] پیش کیا،

بفرمود تا زین بر آہو ہم نہند ۔۔۔ بہ پشت صبا مسندِ جم نہند

میرزا نے بہت تعریف کی، یہ واقعہ غلام علی آزاد نے ید بیضا میں خود لائق جونپوری کی زبان سے نقل کیا ہے، لیکن قیاس میں نہیں آتا کہ صائب **شفائی** کے شعر کو فردوسی کے مقابلہ میں لائے، اور پھر خود جواب لکھنے کا ارادہ کرے،

کلام پر رائے ۔۔۔ میرزا صائب کا خاص انداز تمثیل ہے تمثیل کا طریقہ پہلے بھی تھا لیکن صائب

[1] ید بیضا،

نے اس کثرت سے اس کو برتا کہ اس کی خاص چیز ہو گئی، اس کے علاوہ اور شعرا عام مضامین میں تمثیل سے کام لیتے تھے، صائب نے اخلاقی مضامین کے لئے خاص کر دیا، جا بجا خیال بندی، اور مضمون آفرینی بھی پائی جاتی ہے، اور یہ خاص متاخرین کا انداز ہے اگرچہ صائب کے ہاں وہ لطیف خیالات اور عشق و محبت کے اسرار نہیں پائے جاتے جو عرفی و نظیری کے ہاں نہایت کثرت سے پائے جاتے ہیں، تاہم زبان کی فصاحت ترکیب کی بندش، محاورات کا استعمال، ہاتھ سے نہیں جانے پاتا، بخلاف اور متاخرین کے جن کے کلام کو پڑھ کر زبان کی خوبیوں کی طرف مطلق ذہن متوجہ نہیں ہوتا،

اشعار ذیل ملاحظہ ہوں،

خود نگر از در انصاف . در آ تی ور نہ — جذبہ شوق، حریف دلِ خود کام تو نیست
قمریان پاس غلط کردہ خود مے دارند — ورنہ یک سرو درین باغ بہ اندام تو نیست

یعنی قمریوں کو اپنی غلط بات کی آن پڑی ہے ورنہ ایک سرو بھی تیرے قد و قامت کا ہمسر نہیں،

شب، کہ صحبت بحدیث سر زلف تو گذشت — ہر کہ برخاست زجا سلسلہ بر پا برخواست
یادگار جگر سوختۂ مجنوں ست — لالۂ چند کہ از دامن صحرا برخاست
نہ شبنم ست چمن را بروئے آتشناک — عرق ز روے تو کردہ است گل بدامن پاک
تو فکر نامۂ خود کن کہ مے پرستان را — سیاہ نامہ نخواہد گذاشت گریۂ تاک
دلم بپاکیِ داماں غنچہ مے لرزد — کہ بلبلاں، ہمہ مستند و باغبان تنہا
چشم عاشق زتماشاے تو چوں سیر شود — ہر نگہ سلسلہ جنبانِ نگاہِ دگر ست
کہ گذشت ست کہ ازیں بادیہ دیگر کامرو — نبض رہ مے طپد و سینۂ صحرا گرم ست

طوفان گل و جوش بہارست بہ بینید ... اکنوں کہ جہاں بر سر کارست بہ بینید

عالم بیخبری طرفہ بہشتے بودہ است ... حیف صد حیف کہ ما دیر خبردار شدیم

ہم ایں جا صلح کن با ما چہ لازم ... کہ در محشر ز ما شرمندہ باشی

دریں دو ہفتہ کہ چوں گل دریں گلستانی ... کشادہ روے تر از راز ہاے مستان باش

تمیز نیک و بد روزگار کار تو نیست ... چو چشم آئینہ در خوب و زشت حیران باش

درونِ خانۂ خود ہر گدا شہنشاہ است ... قدم بروں منہ از حد خویش سلطان باش

میان نور و ظلمت عالمے دارم نمے دانم ... کہ شامم صبح، یا صبح امیدم، شام مے گردد

ایں قدر کز تو دلے چند شود شاد بس ست ... زندگانی، بمراد ہمہ کس نتوان کرد

صائب کے تمثیلیہ اشعار چونکہ عام طور پر زبانوں پر ہیں، اس لئے ہم ان کو قلم انداز کرتے ہیں،

ابوطالب کلیم

ملک الشعرائے شاہجہانی

یہ یگانۂ فن، صحیفۂ شاعری کا آخر ورق ہے، اور اسی کے نام پر (شعر العجم حصۂ سوم) کا خاتمہ ہے،

ہمدان میں پیدا ہوا، لیکن کاشان میں زیادہ قیام رہا، آغاز جوانی میں شیراز جا کر علوم درسیہ کی تحصیل کی[1]،

جہانگیر کے عہد حکومت میں ہندوستان آیا، امرائے جہانگیری میں شاہ نواز خاں صفوی ابن مرزا رستم صفوی ایک مشہور امیر تھا، عالمگیر اور مرزا شجاع اس کے داماد تھے، کلیم نے اول اس کے دربار میں رسائی پیدا کی، لیکن سنہ ۱۰۲۸ ہجری میں وطن کی یاد نے بیچین کیا، اس زمانے کا ہندوستان وہ چیز تھی، کہ کلیم گو وطن کو جاتا تھا، لیکن حسرتوں کا انبار لئے جاتا تھا، اسی حالت میں غزل لکھی جس کے چند شعر یہ ہیں[2]،

ز شوق ہند زاں ساں چشم حسرت بر قفا دارم | کہ رو ہم گر براہ آرم نمے بینم مقابل را

ہندوستان کے شوق میں میری آنکھیں اس طرح پشت کی طرف لگی ہوئی ہیں کہ سامنے کے رخ پر نظر بھی ڈالتا ہوں تو سامنے کا آدمی نظر نہیں آتا،

اسیر ہندم و زیں رفتن بیجا پشیمانم | کجا خواہد رساندن، پر فشانی مرغ بسمل را

بہ ایران میرود نالاں کلیم از شوق ہمراہاں | بپائے دیگراں ہمچوں جرس طے کردہ منزل را

---

[1] شاہجہان نامہ جلد ثانی صفحہ ۳۵۳ [2] خزانہ عامرہ و سرو آزاد،

اس حالت کے ساتھ وطن میں کیا جی لگتا، دو برس بھی گذرنے نہ پائے تھے کہ پھر ہندوستان واپس آیا، اب کی اس نے میر جملہ شہرستانی کا دامن پکڑا[1] میر جملہ کو جہانگیر نے دست خاص سے خط لکھ کر اصفہان سے بلایا تھا چنانچہ ۱۰۲۷ھ ہجری میں باریاب ہوا، دو و نیم ہزاری کا منصب ملا، شاہجہان کے زمانے میں پنجہزاری تک پہنچا کلیم کی شاعری کا اگرچہ سکہ جمتا جاتا تھا، اس کے سرپرست بھی دربار شاہی میں خاص اعزاز رکھتے تھے لیکن جہانگیر تک اس کی رسائی نہ ہو سکی جس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ دربار کا ملک الشعراء طالب آملی تھا اور اس کے سامنے کلیم کا فروغ پانا ممکن نہ تھا، اسی سلسلہ میں یہ بات بھی کہنے کے قابل ہے کہ جس سال یعنے ۱۰۲۸ھ میں طالب آملی کو ملک الشعرائی کا خطاب ملا ہے، اسی سال کلیم ایران کو واپس گیا ہے، اس سے بدگمان طبیعتیں نتیجہ نکال سکتی ہیں کہ کلیم کو رشک نے ہندوستان چھوڑنے پر مجبور کیا ہوگا،

کلیم کی ناکامیابی کی ایک اور وجہ یہ تھی کہ نور جہان بیگم اس کی شاعری کی معتقد نہ تھی اور اکثر اس کے اشعار پر حرف گیری کیا کرتی تھی، ایک دفعہ کلیم نے ایک شعر کہا اور خوب دیکھ لیا کہ کہیں حرف رکھنے کی جگہ نہیں، شعر یہ تھا،

زشرم آب شدم کاب را شکستے نیست ۔۔۔ بحیرتم کہ مرا روزگار چون بشکست

میں شرم سے پانی ہوگیا، حیرت ہے کہ زمانہ مجھ کو کیوں کر توڑ سکا، پانی تو ٹوٹنے کی چیز نہیں،

کلیم نے یہ شعر نور جہان بیگم کے پاس بھیجا، نور جہان فوراً بول اٹھی کہ "یخ بست وپس شکست"، یعنے پانی کو پہلے یخ بنا دیا پھر توڑا[3]

[1] خزانہ عامرہ، [2] سرو آزاد تذکرہ طالب آملی، [3] مراۃ الخیال، بعض تذکروں میں یہ واقعہ طالب آملی کی طرف منسوب ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ کلیم نے دربار میں پہنچنے سے پہلے جابجا خاک چھانی، شاہجہان نامہ میں لکھا ہے کہ وہ دکن میں مارا مارا پھرا، اس کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ کلیم کا ایک قصیدہ ابراہیم عادل شاہ کی مدح میں بھی ہے، ایک اور قصیدہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بیجاپور کے ارادہ سے چلا تھا کہ راہ میں جاسوسی کے شبہہ میں پکڑا گیا اور قلعہ شاہدرک میں قید رکھا گیا۔

چنانچہ کہتا ہے،

فلک قدرا! نمے پُرسی کہ گردون — چرا آزُرد ما را بے محابا
چرا آزُردہ بیمار غمے را — کہ مے آمد بدرگاہِ مسیحا
بعزم سیر بیجاپور گشتم — رہے با اخترے چوں دشت بیما
بچنگ راہداراں او فتادیم — چہ گویم تا چہا کردند برما
ہمہ اندر تجسّس موشگافاں — ہمہ در گنج کاوے ذہن دانا
یکے گوید کہ دُزد انند باشند — بزندان چند گہ زنجیر فرسا
دگر گوید کہ جاسوس فلانند — کہ از تفتیش ما گشتند بینا
یکے مے گوید ایناں را بکاوید — کہ شاید نامۂ گردد ہویدا
زبس تفتیش از ہم مے کشودند — اگر در بار ما بودے معمّا
کنوں در چنگ ایشاں مبتلائیم — نمے دانیم چارہ جز مدارا
زبہر پاس، ہندوہاے باتیغ — چو مو استادہ دایم بر سر ما
عجب دارم کہ با ایں منع جادہ — چساں بےخواست آمد تا باینجا

یہ قصیدہ شاہ نواز خاں کے نام لکھا ہے اور اخیر میں لکھا ہے،

اشارت کن کہ چوں اقبال گردیم — بخاک آستانت جبہہ فرسا

بہرحال رفتہ رفتہ شاہجہان کے دربار میں رسائی ہوئی؛ اور ملک الشعرا کا خطاب ملا، ۱۰۴۴ھ میں جب شاہجہان نے کروڑ روپے کی لاگت سے تخت طاؤسی طیار کرایا اور آگرہ میں جشن نوروز کے دن اس پر جلوس کی رسم ادا کی تو کلیم نے قصیدہ لکھا،

خجستہ مقدم نوروز و غرۂ شوال — فشاندہ اندچہ گلہائے عیش بر سر سال

شاہجہان نے اس کے صلے میں روپے کے برابر تلوایا چنانچہ ۵۵۰۰ روپے وزن میں آئے اور اس کو عطا کئے،

کلیم شاہجہان کے ساتھ کشمیر گیا تو وہاں کی رنگینی اور آب وہوا کی دلاویزی کا اس قدر شیفتہ ہوا کہ وہیں کا ہو رہا، بادشاہ سے درخواست کی کہ مجھ کو یہیں رہنے کی اجازت دی جائے، میں یہاں بیٹھ کر اطمینان سے فتوحات شاہی نظم کروں گا، یہ درخواست منظور ہوئی ۱۰۵۵ سنہ ہجری میں جب شاہجہان پھر کشمیر گیا تو کلیم نے قصیدۂ تہنیت لکھ کر پیش کیا اور خلعت اور دوسو اشرفیاں انعام میں پائیں، ۱۰۶۱ سنہ ہجری میں وفات پائی، غنی نے سال تاریخ لکھا، ع

طور معنی بود روشن از کلیم

عام حالات — **کلیم** بخلاف اور شعرا کے نہایت صاف دل، سیر چشم، فیاض طبع تھا معاصر اور حریف شعرا کی عزت کرتا تھا اور گرم جوشی سے ملتا تھا، میرزا صائب اور میر معصوم (ابن میر حیدر معمای) سے خاص محبت تھی، چنانچہ میرزا صائب نے ایک غزل میں اس کا ذکر کیا ہے،

بغیر صائب و معصوم نکتہ سنج کلیم — دگر کہ زاہل سخن مہربان یک دگر اند؟

---

[1] سرو آزاد و تذکرہ میر معصوم،

جلال اسیر کا بہت معتقد تھا، چنانچہ کہتا ہے[۱]،

میرزای با جلال الدین بس ست — از سخن سنجان طلبگار سخن،
راستی طبعش استاد من ست — کج نہم بر فرق دستار سخن،

ملک قمی نے جب انتقال کیا تو کلیم نے قطعۂ تاریخ لکھا جس کے چند شعر یہ ہیں،

ملکِ آں بادشاہ ملک معنی — کہ نامش سکۂ نقد سخن بود
چناں آفاق گیر از ملک معنی — کہ حدِّ ملکش از قم تا دکن بود
بجستم سال تاریخش ز ایام — بگفتا او سر اہل سخن بود

اکثر شعرائے ایران باوجود اس کے کہ ہندوستان میں آکر خاک سے آسمان پر پہنچے لیکن ہندوستان کو گالیاں دیتے ہیں، بخلاف ان کے کلیم ہندوستان کا مداح اور افسانہ خوان ہے، ایک قصیدہ کی پوری تمہید ہندوستان کی مدح ہے، اُس کا ایک شعر یہ ہے،

توان بہشت دوم گفتنش بدین معنی — کہ ہر کہ رفت ازیں بوستاں پشیماں شد

کلیم نہایت حاضر جواب اور مضمون یاب تھا، قیصر روم نے شاہ جہان کو خط لکھا کہ آپ صرف ہندوستان کے بادشاہ ہیں، شاہ جہان کا لقب کیوں اختیار کیا ہے؟ شاہ جہان کو بھی خیال ہوا کہ یہ غلط بیانی ہے، یمین الدولہ سے کہا کہ کوئی اور خطاب اختیار کرنا چاہئے، کلیم کو خبر ہوئی، اُسی وقت قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جسمیں لقب کی یہ توجیہ کی[۲]

[۱] سرو آزاد تذکرۂ جلال اسیر،
[۲] کلمات الشعرا سرخوش، لیکن سرخوش نے دوسرا مصرع جس طرح نقل کیا ہے دیوان میں نہیں اس لئے میں نے دیوان کے مطابق نقل کیا ہے،

ہند و جہان زروے عدد ہر دو چوں یکے ست شہ را لقب شاہ جہانی مبرہن ست

یعنی ہند اور جہان دونوں لفظ کے عدد ایک ہیں (۵۹) اس لئے شاہ جہان اور شاہ ہند دونوں کہہ سکتے ہیں،

خان جہان لودی نے جس کا اصلی نام پیرا تھا جب بغاوت کی اور شکست کھا کر مقتول ہوا تو اس کا اور اس کے شریک بغاوت دریا خاں کا سر ایک ساتھ دربار میں آیا کلیم نے برجستہ رباعی کہی،

ایں مژدۂ فتح از پے ہم زیبا بود ایں کیف دوبالا چہ نشاط افزا بود

از کشتن دریا سر پیرا ہم رفت گویا سر او حباب ایں دریا بود

شاعری | کلیم نے شاعری کی تمام صنفوں کو لیا ہے، قصائد کثرت سے ہیں کئی ثنویاں ہیں، غزلوں کا دیوان الگ ہے، ثنوی مدت سے اپنے پایہ سے گرچکی تھی کلیم کی ثنویاں بھی کم رتبہ بلکہ عامیانہ ہیں، اتنی بات ہے کہ وہ نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں پر نظم لکھتا ہے (اکثر شعرا کے نزدیک یہ بھی ابتذال میں داخل ہے) مثلاً انگوٹھی، قلمدان، کشتی، بندوق وغیرہ وغیرہ، سب کی شان میں قطعات اور رباعیاں لکھی ہیں،

ایک دفعہ گرمی دانے نکلے، اس پر ایک بڑا قطعہ لکھا، تپ آگئی، اس پر بھی نظم لکھ دی، اسی جزئی واقعہ نگاری کا اثر ہے کہ اور ایرانیوں کے برخلاف، ہندوستان کے بہت سے پیشوں، صنعتوں، پھولوں اور پھلوں کے نام لکھ دیتے ہیں جن کا نام بھی زبان قلم پر لانا اور شعر اگناہ سمجھتے تھے، عرفی عمر بھر ہندوستان میں رہا، لیکن عمر بھر میں صرف ایک ہندی لفظ جھگڑ زبان سے نکلا، وہ بھی اس طرح بدل کر کہ گویا فارسی ہے، طالب آملی نے رام رنگی ایک شعر میں باندھ دیا، اس کو لوگوں نے تعجب سے دیکھا، لیکن کلیم سینکڑوں

ہندی الفاظ بولتا چلا جاتا ہے، مثلاً

منہ بروعدۂ تنبولیاں دل — کہ جز خون خوردن ازوے نیست حاصل

زحسن شستہ دھوبی چگویم — ازاں بے پردہ محبوبی چگویم

غرور حسن با جہل پٹھانی — چو گردد جمع نتوان زندگانی

بتانِ راجپوت و شیخ زادہ — شکیب عاشقان برباد دادہ

چہ چنبہ شعلۂ شمعے ست بے دود — کہ آتش مے زند در خرمنِ عود

زموزونان نظر دریوزہ دارم — کہ وصف مولسری را بر نگارم

گل گڈھل نہ فہمید ست موسم — شگفتہ چوں رخِ یار ست دایم

نہال نیمش از بس خوش نسیم ست — دل طوبی ز رشک آں دو نیم ست

جو قابل ذکر واقعات اس کے زمانے میں پیش آتے، سب پر اس نے کچھ نہ کچھ لکھا ہے
عالمگیر شہزادگی کے زمانے میں جب اس کی عمر ۱۴ برس کی تھی، مست ہاتھی سے
لڑا تھا، جس کی کیفیت یہ ہے۔ کہ شاہجہان ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھ رہا تھا، شہزادے
بھی گھوڑوں پر سوار تماشے میں مصروف تھے، عالمگیر قریب سے دیکھنے کے لئے جوش
شجاعت میں گھوڑے کو آگے بڑھاتے جاتا تھا، ایک ہاتھی حریف کو چھوڑ کر عالمگیر پر
جھکا۔ عالمگیر نے پیشانی کو تاک کر برچھا مارا، ہاتھی نے غصہ میں آکر گھوڑے کو دانتوں میں
دبا لیا، عالمگیر زمین پر آیا، لیکن جھٹ پٹ اٹھ کر ہاتھی پر حملہ آور ہوا، ادھر راجہ جے سنگھ
نے بڑھ کر پے در پے برچھے کے وار کئے، ساتھ ہی مقابل کا ہاتھی آپہنچا، اور یہ ہاتھی بھاگ
نکلا شاہجہان نے عالمگیر کو گود میں لیکر پیار کیا اور اشرفیوں میں تلوا کر اشرفیاں خیرات کیں، [1]

[1] شاہجہان نامہ، واقعات ۱۰۴۱ھ ہجری،

کلیم بھی اس واقعہ میں موجود تھا، چنانچہ ایک قطعہ اور ایک مثنوی میں اس واقعہ کی پوری کیفیت لکھی، مثنوی یہ ہے،

بہانیِ گوش ارباب ہوش	یکے قصہ دارم بمن دار گوش
حدیثے سراسر بیان وقوع	بگویم بتو از زبان وقوع
ز مردم من ایں نقل نشنیدہ ام	من از دل شنیدم دل از دیدہ ام

ابتدائی واقعات لکھ کر کہتا ہے،

دوید از قضا آں دو فیل مہیب	یکے سوے شہزادہ اورنگ زیب
بمردی ز جا، یک سر مو نہ شد	ز راہ چنیں سیل یک سو نہ شد
یکے نیزۂ برق ساں تافتہ	نظر از رگِ غیرتش باختہ
ز قدرت چناں زد بہ پیشانیش	کہ جست از قفا برق رخشانیش
دراں کوہ پیکر نہان شد سنان	دگر بار در رفت آہن بہ کان
ز خرطوم انداخت، پیچان کمند	فتاد اسپ شہزادہ در پیل بند
گرفت اسپ و شہزادہ بر وے سوار	ز بیم آب شد زہرۂ روزگار
چو در اسپ سامانِ جولان ندید	چو شہبازے از خانۂ زین پرید
ہماں دم کہ بر خاک پا را فشرد	رواں دست جرأت بشمشیر برد
علم کردہ شمشیر بر روے دوید	گراں سوے فیل غنیمش رسید
دریں سن اگر بودے افراسیاب	ہمی گشت از دیدن فیل آب
در آغاز و انجام آں گیر و دار	ہمی دید شاہنشہ کامگار
ازاں شیر دل چوں بدید آں جگر	بفرقش بیفشاند گنج و گہر

نظیر کردۂ شاہ آفاق شد بمردانگی در جہاں طاق شد

قصائد | قصیدہ میں حاجی محمد جان قدسی کا انداز ہے، یعنی عرفی اور نظیری کی پیچدار اور مشکل بندشیں صاف کر دیں، اور مبالغہ اور حسن تعلیل کو وسعت دی، لیکن اس کے ساتھ تصیدہ کی متانت، زور اور بلندی کم ہوگئی اور غزلیت کا رنگ غالب آگیا،

جس چیز کو لوگ مضمون آفرینی کہتے ہیں، کلیم کے یہاں اس کی اس قدر بہتات ہے کہ ہر قصیدہ گویا مضامین کا ایک انبار ہے قصائد کی تمہید اکثر اصلی واقعات سے شروع کرتا ہے، مثلاً موسم کی گرمی، اور سردی، یا سفر کی سختی پہاڑوں کی دشوار گذاری، لیکن خیالی مضمون آفرینیاں کر کے ایک طلسم بنا دیتا ہے، جس کو واقعیت سے کچھ علاقہ نہیں ہوتا، تاہم جستہ جستہ انہیں میں ایسے شعر بھی نکل آتے ہیں جو شاعری کی جان ہیں، مثلاً

ابر و بہار،

سحاب از تیر باران بہاری بہ بستان جملہ گلہا را نشان کرد
بنوعے آتش گل در گرفتہ ست کہ بلبل رفت و در آب آشیان کرد

دگر بہار جہان را چنان گلستان کرد کہ شوق سیر چمن، سرو را خرامان کرد
چو دام دار تہیدست از خجالت ابر بزیر سبزہ، زمین روئے خویش پنہاں کرد
زناز کی نتوان غنچہ راز گلبن چید گل حباب بیار د کسے بدامان کرد
مقدوم
نازکی کیوجہ سے کوئی شخص کلی کو توڑ نہیں سکتا جس طرح حباب کا پھول دامن میں نہیں لیا جاسکتا
چراغ روز، مگو بے فروغ مے باشد بہ بیں کہ لالہ در و دشت را فروزان کرد
یہ نہ کہو کہ دن کے چراغ میں روشنی نہیں ہوتی دیکھو لالہ نے کس طرح صحرا کو روشن کر دیا ہے

اگر ز عالم بالا نوید رحمت نیست | بخاک ایں ہمہ باراں چہ مے برد پیغام
سرود محفل مستان اگر دمے بشنود | نہادہ ابر بہر خانہ اسینہ بر لب بام
شگوفہ پیرہن تر بشاخ اگرچہ فگند | ندید پر تو خورشید را دریں ایام

سردی کی شدت،

خورشید دگر نقاب دارست | منقل معشوق در کنارست
محراب جہانیان بخاری ست | تسبیح خلایق از شرارست
چوں آئینہ بستہ شد نفسہا | دل از دم سرد سنگ سارست
یخ بر سر کوچہ بندی آمد | نہ راہ پیادہ نے سوارست
گوئی تو، کہ پنبہ اش ز برفاست | پوشش بر تن اگر ہزارست
مرغابی ہمچو نقش ابرے | بر کاغذ یخ بہ یک قرارست
ماہی دریخ میان جدول | چوں موج بہ تختۂ چنارست

اس زمانے میں قصائد کا کمال صرف مبالغہ، تشبیہ، حسن تعلیل، اور مغالطہ شعری پر محدود تھا اور اس میں شبہہ نہیں کہ یہ اوصاف کلیم کے قصیدوں میں نہایت افراط، اور نہایت وسعت کے ساتھ پائے جاتے ہیں، اس کے یہاں ترکیبوں کا سلجھاؤ، روزمرہ کی صفائی محاورات کی برجستگی، شستگی اور روانی بھی اس حد تک ہے کہ اس کے ہم عصروں میں نہیں ہے، طالب آملی سے وہ جدت استعارات اور شوخی میں کم ہے، لیکن اور اوصاف میں اس سے بہت آگے ہیں، بعض بعض قصیدوں کے مسلسل اشعار ہم اس موقع پر نقل کرتے ہیں جس سے اس کا اندازہ ہوگا،

در آستان جلالش عصاے دربان را | فلک ز سدرۂ رضوان زشاخ طوبیٰ داد

کفِ سخاش غلط بخش نیست ہمچو سحاب
سحاب ہرچہ بدریا فشاند بیجا داد

فراستش بخبر گیری ممالک رفت
چو باز گشت خبر ز آشیانِ عنقا داد

بہ تیر امرش حکم نفاذ داد آں کس
کہ دلبری بکمان ابروان رعنا داد

نمود خاکِ درش را کہ توتیا ایں ست
خدا نخست بہر کس کہ چشم بینا داد

چو خسروان کہ اسیر غنیم باز دہند
کفِ عطاش گہر را دگر بدریا داد

یعنی جس طرح بادشاہ، دشمن کے قیدیوں کو واپس کردیتے ہیں، ممدوح نے موتی دریا کو واپس دیدیا

گردون نشاط کودکے از سر چنان گرفت
کانگشتر کواکبش، از سر توان گرفت

آسمان اس قدر طفلانہ خوشی میں مصروف ہے کہ چاہیں تو اُس کے ہاتھ سے ستاروں کے چھلّے اُتار لیں اور اس کو خبر نہ ہو،

از شیشہ، استفاضہ انوار مے کنند
عالم تمام مذہب اشراقیان گرفت

اکنوں ہجوم کام بود مانع وصال
گُل پُرشد آنچناں کہ درِ بوستان گرفت

اب مقصد کا ہجوم ہی وصال کا مانع ہے
پھول اسقدر پٹ پڑے ہیں کہ باغ کا دروازہ رک گیا

زیں ساں کہ روزگار جوانمرد خوش اداست
تاوانِ عمر رفتہ توان از جہان گرفت

ایں روے تازہ کہ جہان را نمود رُو
گوئی ز گرد موکب شاہجہان گرفت

مدحیہ مضامین ہزاروں دفعہ پامال ہوچکے ہیں اس لئے کسی شاعر کی زور طبع اور جدّت آفرینی کا اندازہ کرنا ہو تو خاص ان موقعوں کو پیش نظر رکھنا چاہئے کلیم اگرچہ مدح سے بچتا ہے یعنی طبیعت کا اصلی زور، بہار وغیرہ کی تمہید میں صرف کردیتا ہے تاہم اسکی جدّت آفرینیاں استعجاب کے قابل ہیں،

بعہدش آنچناں در خواب امن است | کہ باید پاسبانے پاسبان را
اُسکے زمانہ میں لوگ اس قدر چین سے پڑے سوتے ہیں کہ خود پاسبان کیلئے ایک پاسبان درکار ہے

بہ کشش راہ زن مانند جادہ | بمنزل مے رساند کاروان را
اُس کی سلطنت میں خود راہزن، راستہ کی طرح قافلہ کو منزل تک پہنچا دیتا ہے

بعہد عدل او واپس ستانند | چمن از خاک زرہائے خزان را
کفش پرداخت کانِ گوہر و زر | فلک برچید آخر ایں دکان را
درون شیشہ افلاک بیند | بسانِ مے افضائے آسمان را

زحرف رفعتِ شانش قلم بخود لرزد | بہ احتیاط، قدم مے نہند در کہسار
دلش غبار خلایق نکردہ است قبول | نگیرد آئینۂ آفتاب راز نگار
سخن نگفتن اول بہ نزد فطرت او | عجب مدار کہ معیوب گردد از تکرار
بروز نگارش، ناراستی بر افتادہ است | بغیر سیل نیابی بہ دہر کج رفتار
گناہِ عالمیان گر ہمہ صدا گردد | زکوہ حلمش آواز نشنوی یکبار

غزل

کلیم کا اصلی کمال غزل گوئی ہے، غزل میں اس کے پیش رؤں نے خاص خاص باتیں پیدا کی تھیں، مثلاً، عرفی نے فلسفہ، **نظیری** نے تغزل، **طالب آملی** نے شوخی استعارات، وحشی اور میلی نے معاملہ بندی کلیم کے ہاں گو تغزل کے سوا اور سب کچھ ہے لیکن اُس کا خاص رنگ مضمون بندی اور خیال آفرینی ہے، مثالیہ جو **صائب** کا خاص انداز ہے اُس کی ابتدا بھی کلیم ہی نے کی، فلسفہ میں وہ بہت دقیق باتیں پیدا نہیں کرتا لیکن اس عنوان پر اُس نے جو کچھ لکھا ہے، جمع کیا جائے تو اچھا خاصہ فلسفہ ہو جائے گا غزل

ہیں اس کے خصوصیات کو ہم الگ الگ عنوان کے ذیل میں لکھتے ہیں،

مضمون آفرینی اور خیال بندی جس چیز کو لوگ مضمون آفرینی کہتے ہیں اس کی تحلیل کی جائے تو وہ یا کوئی نیا استعارہ یا تشبیہ ہوتی ہے، یا کوئی انوکھا مبالغہ ہوتا ہے، یا کوئی شاعرانہ دعوے ہوتا ہے جو دراصل صحیح نہیں ہوتا، لیکن شاعر اس کا مدعی ہوتا ہے اور شاعرانہ استدلال سے ثابت کرتا ہے اُسی کو حُسن تعلیل بھی کہتے ہیں، یہ سب باتیں کلیم کے ہاں نہایت اعلےٰ درجہ پر پائی جاتی ہیں مثلاً

بسکہ ز دیدہ ریختم خون دل خراب را — گریہ گرفت در حنا پنجۂ آفتاب را

میں نے اسقدر خون آنکھوں سے بہایا کہ میرے آنسوؤں نے آفتاب کے پنجہ میں مہندی لگادی

مے نہم در زیر پائے فکر، کرسی از سپہر — تا بکف مے آورم یک معنی برجستہ را

فکر کے پاؤں کے نیچے آسمان کی کرسی رکھ لیتا ہوں، تب ایک برجستہ مضمون ہاتھ میں آتا ہے،

سپہر دُون در فیض آنچناں بست است در عالم — کہ سیلاب بہاری تر نمے سازد لب جُو را

آسمان نے فیض کا دروازہ اسطرح بند کر لیا ہے کہ بہار کا سیلاب نہر کے لب کو بھی تر نہیں کرسکتا،

حدیث بحر فراموش شد کہ دور از تو — زلبس گریستہ ام، آب برد دریا را

لوگ دریا کی کہانی بھول گئے اس لئے کہ میں اس قدر رویا کہ دریا کو پانی بہالے گیا،

شعلہ بے می خواست از بیطاقتی و مے نشست — من نہ جنبیدم ز جا تا جا بہ گلخن داشتم

شعلہ بے صبری کی وجہ سے اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ جاتا تھا، لیکن میں جب تک آگ میں رہا ذرا جنبش نہیں کی،

خون دل ارو بہ کمی کرد ز سوز تپ ہجر — آں قدر نیست کہ یک آبلہ را آب دہد

شراب کہنہ می نوشم بہ بزم او چو بنشینم — بمن تا نوبت آید او خترِ رز پیر مے گردد

زاں برق حسن کآفت ہر گوشہ گیر شد　　آتش درآشیانہ عنقا گرفتہ است

یک رہبرم دریں شب تاریک نخورد　　چوں آفتاب دست بدیوار مے کشم

اس شب تاریک میں مجھکو کوئی رہنما نہیں ملا، آفتاب کی طرح میں دیوار پکڑ کر چلتا ہوں

مثالیہ | مثالیہ مضامین پہلے بھی خال خال پائے جاتے تھے امیر خسرو کا مشہور قصیدہ، سرتاپا اسی صنعت میں ہے، لیکن کلیم، میرزا صائب اور غنی نے گویا اس کو ایک خاص فن بنادیا' چونکہ یہ تینوں شاعر کشمیر میں مدت تک ساتھ ہمدم و ہم قلم رہے تھے اور باہم مشاعرے رہتے تھے، اس لئے قیاس یہ ہے کہ ہم صحبتی کے اثر نے اس طرز کو مشترک جولانگاہ بنادیا، علی قلی سلیم بھی مثالیہ میں کمال رکھتا ہے اور اس کی بھی وجہ شاید یہی ہو کہ سلیم بھی یہیں (کشمیر) میں مدفون ہے،

بہرحال کلیم نے اس صنف کو بہت ترقی دی، اس کے اکثر دعوے فی نفسہ صحیح ہوتے ہیں لیکن استدلال شاعرانہ ہوتا ہے، بعض جگہ دعوے اور دلیل دونوں خیالی ہوتے ہیں اور وہاں شاعرانہ تخییل زیادہ پائی جاتی ہے مثلاً،

جُز سوز عشق نیست سراسر بیان ما　　چو شمع، یک سخن گذرد بر زبان ما

مرا مسوز کہ نازت ز کبریا افتد　　چوں خس تمام شود شعلہ ہم زپا افتد

مجھ کو نہ جلاؤ ورنہ تمہارا غرور بھی جاتا رہے گا، جب خس جل چکتا ہے تو شعلہ بھی بجھ جاتا ہے

روشن دلاں خوشامد شاہاں نگفتہ اند　　آئینہ عیب پوش سکندر نمے شود

مدعی گرطرفِ ما نشود، صرفۂ اوست　　زشت آں بہ کہ بہ آئینہ برابر نشود

دشمن اگر ہمارا مقابلہ نہ کرے تو اس میں اسی کا فائدہ ہے، بدصورت کے حق میں یہی بہتر ہے کہ آئینہ کے سامنے نہ آئے،

مقبول روزگار نگشتیم و ایمنیم | مارا کہ برنداشتہ، چوں بر زمین زند
در محفلے کہ تازہ در آئی گرفتہ[1] باش | اوّل بہ باغ، غنچہ گرہ بر جبین زند
در روزگار دیدم از راستی نشان نیست | صبحش کہ صادق آمد، در شیر آب دارد

زمانہ میں سچائی کہیں نہیں پائی جاتی، صبح صادق کو، صادق کہتے ہیں، لیکن وہ بھی دودھ میں پانی ملاتا ہے، صبح کی روشنی کو پانی سے تشبیہ دی ہے،

قطع امید کردہ، نخواہد نسیم دہر | شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست
روشندلاں، حباب صفت دیدہ بستہ اند | روزن چہ احتیاج، اگر خانہ تار نیست
روزگار اندر کمین بخت ماست | دزد دایم در پے خوابیدہ است
پامال حوادث، نتوانم کہ نباشم | چوں نقش قدم، خانۂ من بر سر راہ است
دارد اگر صفائے دل از شراب دارد | روشن نزست شیشہ وقتیکہ آب دارد

دل میں صفائی آتی ہے تو شراب سے آتی ہے، شیشہ میں جب پانی ہوتا ہے تو زیادہ چمکتا ہے

صبر گوارا کند ہر چہ ترا ناخوش است | ساعتے از کف بنہ، آب گل آلود را

ناگوار چیز بھی صبر کرنے سے گوارا ہو جاتی ہے، پانی گردآلود ہو تو ذرا ٹھہر جاؤ گرد نیچے بیٹھ جائے گی،

کیسۂ وعدہائے بخت نتوان دوختن | خفتہ گر در خواب حرفی گفت، ازاں آگاہ نیست
دل گمان دارد کہ پوشیدہ است راز عشق را | شمع را فانوس پندارد کہ پنہان کردہ است
دل آگاہ مے باید وگرنہ | گدا یک لحظہ بے نام خدا نیست
مے پذیرند بداں را بطفیل نیکاں | رشتہ را پس[2] ندہد آں کہ گہر مے گیرد

---

[1] گرفتہ، یعنی اپنے آپ کو لئے ہوئے جس سے بظاہر رکھائی محسوس ہو،

[2] پس دادن، واپس دینا،

چون خس و خاشاک سیلاب انیم از گمرہی　　پا بر دوش راہبر دایم بمنزل میرویم

ہم کو سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح گمرہی کا ڈر نہیں، اس لئے کہ ہم خود رہنما کے کندھوں پر سوار ہوکر سفر کرتے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ خس و خاشاک کا رہنما سیلاب ہی ہے اور خس و خاشاک سیلاب ہی کے کاندھے پر سوار ہیں،

نام و نشان ز عشق بغیر از ہوس نماند　　از سیل رفتہ خار و خسے یادگار ماند

از خاک برگرفتہ دوران[1] ہچو نے سوار　　دایم پیادہ رفت اگرچہ سوار شد

از ہنر حال خرابم نشد اصلاح پذیر　　ہمچو ویرانہ کہ از گنج خود آباد نشد

ہنر اور علم نے میری حالت کی اصلاح نہ کی، جس طرح ویرانہ کے خزانہ نے اُسکو آباد نہ کیا،

اقلیم دل بہ زور مُسخّر نمے شود　　این فتح بے شکست میسّر نمے شود

چرخ از بهر تو در کار بود حرصِ تو چیست　　آسیا از پئے رزق دگران بر گردد

سفلہ از قربِ بزرگان نکند کسب شرف　　رشتہ پر قیمت از آمیزش گوہر نشود

دست ہر کس را ببسان سبحہ بوسیدم چہ سود　　ہیچ کس نکشود آخر عقدۂ کارِ مرا

با من آمیزش او الفتِ موج ست و کنار　　دمبدم با من و پیوستہ گریزاں از من

چو ہست قدرت دست و دلِ توانگر نیست　　صدف کشادہ کف است آں زماں کہ گوہر نیست

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست　　رو پس نکرد ہر کہ ازیں خاکدان گذشت

مڑکر نہ دیکھا

بخضرم احتیاجے نیست گر این است گمراہی　　کہ کوران را عصا ہم مے تواند راہبر باشد

نہ ہر کہ صدر نشین شد عزیز شد کہ غبار　　اگر بدیدہ رسد، تو تیا نخواہد شد

واصل[2] ز حرف چون جرِ البتہ است لب　　چوں رہ تمام گشت، جرس بے زبان شود

---

[1] یعنی جسکو زمانہ نے بلند کیا ہو، [2] یعنی جو شخص مدارج معرفت طے کر کے منزل تک پہنچ گیا ہے،

شیطان چہ تمتع برد از اہل تجرد — رہزن چہ دریں بادیہ از ریگ رواں یافت
تمام نسل بزرگان اگر نکو باشند — ز بحر زادہ، تنک ظرفی حباب چراست
گر بقسمت قانعی، بیش و کم دنیا یکے است — تشنہ چوں یک جرعہ خواہد کوزہ و دریا یکیست
پست فطرت، ہوس گوشہ عزلت نکند — تا گدا بر سر رہ نیست، دلش خرم نیست
امروز چراغ اہل فقرم — چوں فانوسم، و دپیرہن نیست
خاکساران بیشتر از فیض قسمت مے برند — کلبۂ دیوار کوتاہان، پر از مہتاب بود
چشم از جہان بر بستم نورِ دلم فزود — روشن شدہ است خانہ‌ام چو روزن گرفتہ ام[۱]

قوت تخییل

اکثر لوگوں کے نزدیک شاعری، صرف قوت تخییل کا نام ہے، اور اگر یہ صحیح ہے تو کلیم ہمہ تن شاعری ہے، اس کا ہر شعر قوت تخییل کا ایک منظر ہے، شاعر کو تمام عالم اور عالم کے تمام واقعات، قوت تخییل کی وجہ سے ایک اور ہی صورت میں نظر آتے ہیں، مثلاً ہوا کے زور سے پھول کا ایک پتہ ٹہنی سے ٹوٹ کر پانی میں گر پڑا، یہ ایک معمولی واقعہ ہے لیکن شاعر کو قوت تخییل سے نظر آتا ہے کہ یہ بہار کے حُسن کا دفتر ہے اور چونکہ معشوق کے حُسن کے سامنے اس کی قدر نہیں ہو سکتی اس لئے بہار نے اس دفتر کو پانی سے دھوڈالنا چاہا ہے،

دفتر حُسنِ بہارست، کہ در عہد تو شست — برگ گل نیست، کہ از باد، در آب افتادہ است

کلیم کے کلام کو دیکھو تو صاف نظر آتا ہے کہ مناظر عالم کی ایک ایک چیز پر اُس کی نظر پڑتی رہتی ہے اور قوت تخییل سے یہ چیزیں اس کے سامنے نئے نئے رنگ میں جلوہ گر ہوتی رہتی ہیں،

وہ اندھیری راتوں میں گھبراتا ہے اور اس کو نظر آتا ہے کہ ستاروں کے چراغ میں

[۱] یہاں گرفتن کے معنے بند کرنے ہیں،

روغن نہیں رہا،

شکوہ کم کن، در چراغ اختران روغن نماند
بعد ازیں تاریکی شبہا بخود خوش کن کلیم

حکما کہتے ہیں کہ عالم کا آغاز اور انجام معلوم نہیں کلیم کی نظر میں قوت تخیل سے عالم ایک پرانی کتاب بن کر نظر آتا ہے اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کتاب کے اوّل و آخر کے ورق گر گئے ہیں،

اوّل و آخر ایں کہنہ کتاب افتادہ است
ما ز آغاز و ز انجام جہاں بیخبریم

محتسب کی دار و گیر نے میخانے برباد کر دیئے، لیکن کلیم یہ کہتا ہے کہ معشوق کی آنکھیں میکدہ ہیں اور اس کی مستی کے آگے شراب کی قدر نہیں اس لئے کوئی شخص میخانوں کی طرف رُخ نہیں کرتا اور وہاں خاک اُڑنے لگی، اُس کے نزدیک یہ محتسب کی کارگذاری نہیں، بلکہ محتسب معشوق کی آنکھ کا ممنون ہے،

ہر کجا میکدۂ ہست خراب اُفتادہ ست
شکر چشم تو کند، محتسب شہر کزد

بہار میں ہر شخص چاہتا ہے کہ سب سے پہلے پہنچکر لب جو پر قبضہ کرے کلیم کی وسعت تخیل دیکھو، وہ سبزہ سے بھی پہلے، لب جو پر قبضہ کرنا چاہتا ہے،

پیشتر از سبزہ مے باید کنارِ جو گرفت
در بہاران جامے افتد بدست کس بباغ

بہار میں کسی کو جگہ باغ میں نہیں ملتی، اس لئے سبزہ سے بھی پہلے چل کر لب جو پر قبضہ کر لینا چاہئے

صبح کے وقت کلیوں کی شگفتگی، ہر شخص کو لطف دیتی ہے، لیکن دیکھو کلیم اس کو کس نظر سے دیکھتا ہے،

در شیر صبح خندۂ گل ہا شکر گذاشت
شیرینی تبسم ہر غنچہ را مپرس

کلیوں کی شیرینی تبسم کا لُطف نہ پوچھو، پھولوں کی ہنسی نے صبح کے دودھ میں شکر گھول دی

سب لوگ کہتے آتے ہیں کہ آسمان، قابل آدمیوں کا دشمن ہے کلیم کو اس پر تعجب ہوتا ہے کہ آسمان کو قابل اور ناقابل کی تو تمیز ہی نہیں، قابل آدمیوں کو پہچانتا کیونکر ہے کہ خاص انہی کو ستاتا ہے،

حیرتے دارم کہ گردون چو بدانایان بدست
او کہ نتواند میان نیک و بد تمیز کرد

آگ کی لو اگر اونچی ہو ہو کر کم ہو جاتی ہے کلیم کو نظر آتا ہے کہ شعلہ میں ضبط کی طاقت نہیں، اس لئے بیقراری کی وجہ سے اُٹھ اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے، اس کے مقابلہ میں اپنے سکون اور استقلال پر فخر کرتا ہے،

شعلہ بر مے خواست از بے طاقتی و مے نشست
من نہ جنبیدم ز جا تا جا بہ گلخن داشتم

مر کر کوئی زندہ نہیں ہوتا، کلیم کو اس سے خیال پیدا ہوتا ہے کہ دنیا ایسی چیز ہے کہ کوئی شخص دوبارہ اس کے دیکھنے کی طرف رُخ نہیں کرتا،

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست
رُو پس نہ کرد، ہر کہ ازیں خاکدان گذشت

رہ نوردی میں پاؤں میں چھالے پڑ گئے ہیں، انہیں میں کانٹے بھی چبھتے جاتے ہیں کلیم سمجھتا ہے کہ یہ اُنگلیاں ہیں، اور راستہ، ان انگلیوں سے میرے چھالوں کا حساب لے رہا ہے،

دارم رہے بہ پیش کز انگشت خارہا
از من حساب آبلۂ پا گرفتہ است

کلیم اُن مضامین میں جو مدتوں سے جولانگاہ خیال ہیں ایسے نکتے پیدا کرتا ہے جن کی طرف کسی کا خیال نہیں گیا،

مثلاً یہ عام اعتقاد ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے تقدیر سے ہوتا ہے، کلیم کہتا ہے،

این قدر فرق امیانِ خطِ یک کاتب چیست　　　　سرنوشتِ ہمہ گر از قلمِ تقدیر یست

اگر سب کی سرنوشت تقدیر ہی نے لکھی ہے تو ایک کاتب کے خط میں اس قدر فرق کیوں ہے

کہ ہر شخص کی تقدیر الگ الگ ہے،

جنون اور صحرا نوردی کا مضمون سب باندھتے آتے ہیں کلیم باوجود ادعاے

جنون کے صحرا نوردی اختیار نہیں کرتا اور اس سے جنون کا زیادہ زور ثابت کرتا ہے،

اگر بہ بادیہ گردی نمے روم، چہ عجب　　　　جنون من نہ شناسد ز شہر صحرا را

میں اگر صحرا میں نہیں جاتا تو تعجب کیا ہے　　　　میرا جنون، شہر اور صحرا میں تمیز نہیں کر سکتا

اس میں صحرا نوردون پر چوٹ بھی ہے کہ پورا جنون ہوتا تو اُن کو شہر اور صحرا کی

تمیز کیونکر ہوتی کہ جب بھاگتے تو صحرا ہی کی طرف بھاگتے،

عنقا کا تجرد اور ترکِ تعلقات، عام مضمون ہے، کلیم اس کے تجرد کو ناتمام سمجھتا ہے

در کیشِ ما تجرد عنقا تمام نیست　　　　در فکرِ نام ماند، اگر از نشان گذشت

زمانہ کے انقلاب پسندی کے سب مدعی ہیں، کلیم کو اس پر تعجب ہے کہ پھر

میری حالت کیوں نہیں بدلتی،

ز انقلابِ سپہر دورو، عجب دارم　　　　کہ بیقراری ما را بہ یک قرار گذاشت

باغبان اور گلچین ہمیشہ پھول توڑتے ہیں، کلیم کلیوں کا توڑنا ثابت کرتا ہے

اور اس کی کس قدر عمدہ توجیہ کرتا ہے،

در گلستان، بہ یاد دہانِ تو غنچہ را　　　　امسال، باغبان ہمہ نشگفتہ چیدہ بود

باغبان کو تیرا دہن یاد آیا، تو اُس نے　　　　ابکی سال تمام پھول بن کھلے توڑ لیئے

حُسنِ اخلاق کی بڑی دلیل، لوگوں کے نزدیک قبول عام ہے، یعنی جب آدمی

کے اخلاق عمدہ ہوتے ہیں جب ہی مقبول عام ہوتا ہے، کلیم کہتا ہے نہیں، بلکہ نفاق سے یہ درجہ حاصل ہوتا ہے کیونکہ ظاہرداری کے بغیر حسن قبول نہیں حاصل ہوسکتا، اور ظاہرداری درحقیقت نفاق ہے،

پسند خاطر یک تن نیم چہ چارہ کنم — کہ بے نفاق بہ یک دل نمے تواں جا کرد

جو لوگ بیقاعدہ کام کرتے ہیں اُن کی بے قاعدگی اس قدر پختہ ہوتی ہے کہ کبھی بھول کر بھی کوئی کام باقاعدہ نہیں کرتے، کلیم اس سے یہ نتیجہ پیدا کرتا ہے کہ وہ بیقاعدہ نہیں کیونکہ ان کی بے قاعدگی باقاعدہ ہے، اس خیال کو ایک شاعرانہ پیرایہ میں ادا کرتا ہے،

گاہے، بہ غلط ہم سوے مقصود نہ رفتیم — گویا رہِ آوارگیم، راہبرے داشت

ہم بھول کر بھی کبھی مقصد کی طرف ایک قدم نہیں گئے معلوم ہوتا ہے کہ آوارگی کے راستہ میں ہمارا کوئی رہبر تھا،

زاہد کی صد دانہ تسبیح پر شعرا اعتراض کیا کرتے ہیں، لیکن کلیم اس کی ضرورت ثابت کرتا ہے،

دانہ لبیار در کار ست، بہر صید خلق — حق بدستِ زاہد ست، ار سبحہ را صد دانہ ساخت

راہ طلب میں منزل مقصود کے رُخ پر چلا جانا اور اِدھر اُدھر مڑ کر نہ دیکھنا مستحسن خیال کیا جاتا ہے لیکن کلیم کہتا ہے،

طلب شاہد مقصود زہر سو شرط ست — ہر قدم در رہِ او، رو بقفا باید کرد

شاہد مقصود کو ہر رخ سے ڈھونڈھنا ضروری ہے اس لئے اس راہ میں ہر قدم پر مڑ کر بھی دیکھنا چاہئے،

روزمرہ اور محاورہ

اس زمانہ میں اگرچہ مضمون آفرینی اور خیال بندی کے استیلا نے زبان اور محاورہ بندی کی طرف سے شعرا کو غافل کر دیا تھا، چنانچہ ناصر علی، غنی، بیدل، اسی چکر میں پڑ کر لطف زبان سے بیگانہ ہوگئے، لیکن کلیم باوجود انتہا درجہ کی نازک خیالی کے یہ سررشتہ

ہاتھ سے نہیں چھوڑتا وہ ہمیشہ نئے مضامین پیدا کرنے کی فکر میں مصروف رہتا ہے لیکن یہ نہیں بھولتا کہ وہ ایرانی ہے، ہندی نہیں، اس لئے روزمرہ کے علاوہ، اکثر ٹھیٹ محاورے برتتا ہے، جن کو عام آدمی فرہنگ کے بغیر سمجھ بھی نہیں سکتے، مثلاً

با عارض تو چہرہ شدن حد شمع نیست	چہرہ شدن، مقابل ہونا، حد نیست یعنی مجال نہیں،
گریاں ز بزم رفت و سر خویشتن گرفت	سر خویشتن گرفت، اپنی راہ لی،
از دبستان برود ہر کہ سبق روشن کرد	سبق روشن کرد، سبق یاد کر لیا،
ع، دشمن خود را چرا کس این قدر پہلو دہد	پہلو دادن، پہلو بچانا،
رو نخواہم ساخت ہر صورت کہ خواہد رو دہد	رو ساختن، منہ بگاڑنا، رو دہد، پیش آئے،
امید بوسہ ات چہ نمک داشت اے کلیم	چہ نمک داشت، یعنی اس میں کیا لطف تھا،
ایں شربت کم بہر دو بیمار نباشد،	بہر حصہ، یعنی ایسا نہ ہو کہ یہ تھوڑا سا شربت دو بیماروں کے لئے کافی ہے،
کہ گاہ ہم طرف کہربا نمے گیرد	طرف کسے گرفتن، اس کی جانب داری کرنا،
ع، بچشم روشنی داغہائے کہنہ روم	چشم روشنی، مبارک باد،
ع، شام خود شد روزہ امید را وا مے کنم	روزہ وا کردن، روزہ کھولنا،
چوں حباب از دام ہستی پس دہم خندان شوم	دام واپس دادن، قرضہ ادا کر دینا،
عجب پیرے کہ مے مالد جوان را	مالیدن، پچھاڑنا،
یک زبانم من و نے گویم، سخنے را کہ پشت در و دارد،	پشت در و داشتن سخن، یعنے دو رُخی بات،
پیالہ چشم تو روشن کہ بادہ پیدا شد	چشم تو روشن، دعا کے موقع پر استعمال کرتے ہیں،

اب ہم کلیم کی دو تین غزلیں پوری اس موقع پر درج کرتے ہیں جس سے اندازہ ہوگا کہ اس کا اکثر کلام یک دست اور ہموار ہوتا ہے، اس کے ساتھ اس کے عام لطف بندش جدت ادا اور خوبی زبان کا اندازہ ہوگا،

پیری رسید، و مستی طبع جوان گذشت
ضُعفِ تن از تحمُّلِ رطلِ گران گذشت

وضع زمانہ، قابل دیدن دو بارہ نیست
رُو پس نہ کرد، ہر کہ ازیں خاکدان گذشت

از دست بُرد حُسنِ تو بر لشکر بہار
یک نیزہ خونِ گُل، ز سرِ ارغوان گذشت

طبعے بہم رساں کہ بسازی بعالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم، توان گذشت

در کیش ما تجردِ عنقا تمام نیست
در فکر نام ماند اگر از نشان گذشت

بے دیدہ راہ اگر نتوان رفت، پس چرا
چشم از جہان چو بستی، از دمے توان گذشت

بدنامیِ حیات، دو روزی نبود بیش
آں ہم کلیم با تو بگویم، چساں گذشت

یک روز، صرفِ بستنِ دل شد بہ این و آں
روزے دگر، بہ کندنِ دل زین و آں گذشت

نہ ہمیں مے رمد، آں نو گُلِ خنداں از من
مے کشد خار، دریں بادیہ داماں از من

با من آویزش او الفتِ موج ست و کنار
دم بدم با من، و ہر لحظہ گریزاں از من

گرچہ مورم و لے آں حوصلہ با خود دارم
کہ بہ بخشم، بود ار ملک سلیماں از من

بہ تکلم، بخموشی، بہ اشارت، بہ نگاہ
مے تواں برد بہر شیوہ دل آساں از من

قمری ارنجتہ بالم، بہ پناہِ کہ روم؟
تا بہ کے سرکشی اے سروِ خراماں از من

نیست پرہیز من از زہد کہ خاکم بر سر
ترسم آلودہ شود، دامنِ عصیاں از من

اشک بیہودہ مریز ایں ہمہ از دیدہ کلیم
گردِ غم را نتواں شست بطوفاں از من

از ثبات عشق، دایم پا بدامن داشتم
ہمچو داغِ لالہ، در آتش نشیمن داشتم

شعلہ بر مے خاست از بیطاقتی و می نشست
من نہ جنبیدم ز جا تا جا بگلخن داشتم

گے بہر نامحرمے، چاکِ جگر خواہم نمود
من کہ زخمش را نہان از زخم سوزن داشتم

ہیچ گہ، ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت
دانہ مے چیدم من آں روزے کہ خرمن داشتم

روشنی از بزم من، دریوزہ مے کرد آفتاب
در چراغ عیش تا از بادہ روغن داشتم

ہمچو ماہی غیر داغم، پوشش دیگر نبود
تا کفن آمد ہمیں یک جامہ بر تن داشتم

داغ را جز بر کنار زخم ننہادم کلیم
دیدہ را بر رخنۂ دیوار گلشن داشتم

حصۂ سوم